

باقیات

حامد حسن قادری

مقدمہ و تدوین:
اورنگ زیب فیاضی

اعلى صوت مولانا محمد رضا خان صاحب محمد دماة صافرة ١٣٢
قرن سره الحزير

اعلى صوت بهر لوى كاقصيدة نور ١٣١

باقیاتِ حامد حسن قادری

مقدمہ و تدوین:
اورنگ زیب نیازی

دارالافتاء
دعوتِ اسلامی

مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی

جملہ حقوق محفوظ

مارچ ۲۰۰۶ء

سلسلہ مطبوعات نمبر: ۲۵۱

باقیاتِ حامد حسن قادری

نام کتاب:	باقیاتِ حامد حسن قادری
مصنف:	مولانا حامد حسن قادری
حقوق:	ڈاکٹر خالد حسن قادری
مقدمہ و تدوین:	اورنگ زیب نیازی
ناشر:	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی
مطبع:	طیب اقبال پرنٹرز ۱۷- بی رائل پارک لاہور
تعداد اشاعت:	۳۰۰
صفحات:	۱۶۰
قیمت:	۱۵۰

یہ کتاب حکومت پنجاب کے محکمہ ثقافت اطلاعات و امور
نوجوانان کی مالی اعانت سے شائع ہوئی

ملنے کا پتہ :

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی
9-B جعفریہ کالونی، خدابخش روڈ، لاہور۔

فون: ۷۵۱۲۷۲۳

فہرست

مقدمہ

۷

ادبی مضامین

- | | | |
|----|----|--------------------------|
| ۱۵ | ۱۔ | حالی اور پیروی مغربی (۱) |
| ۱۹ | ۲۔ | // (۲) |
| ۲۳ | ۳۔ | // (۳) |
| ۲۵ | ۴۔ | // (۴) |

علمی و فکری مضامین

- | | | |
|----|----|---|
| ۳۴ | ۱۔ | عالمگیری نسخہ قرآن مجید اور اس کے اغلاط کتابت |
| ۴۵ | ۲۔ | حضرت سلیمان اور ان کے گھوڑے |
| ۵۱ | ۳۔ | شاہد۔ مبشر۔ نذیر |
| ۵۴ | ۴۔ | دنیوی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کی ضرورت |
| ۶۳ | ۵۔ | اسوۂ حسنہ (ترجمہ) |
| ۶۷ | ۶۔ | پردہ ایک تعارف |
| ۷۶ | ۷۔ | آئینہ حرم |
| ۸۴ | ۸۔ | ہم رونے پہ آجائیں..... |

شاعری

- | | | |
|-----|----|--------------------------|
| ۹۵ | ۱۔ | تعبیر ارشادات قرآنی |
| ۱۰۱ | ۲۔ | حالی اور پیروی مغربی (۱) |

- ۳۔ حالی اور پیروی مغربی (۲)
۴۔ تضمین منقبت
۵۔ جلوہ پر نور
۶۔ سلام پینچ
۷۔ جلوہ نیر اعظم
۸۔ تربت معنبر
۹۔ قطعات تاریخ (۱)
۱۰۔ قطعات تاریخ (۲)

۱۱۔ شفا یابی غوثیہ بی متفرق تحریریں

- ۱۔ حضرت مولانا فریدی صاحب کی وفات
۲۔ اذ کرو امواتکم با الخیر
۳۔ حیرت پر حیرت
۴۔ حکیمانہ حکمت
۵۔ خط بنام مدیر "دہدہ سکندری"
۶۔ خط بنام مدیر "ہمدرد"
۷۔ تاریخ ہند منظوم
۸۔ ایک انگریز کا سلام
۹۔ سلام رعنا و صبا اکبر آبادی

☆☆

مقدمہ

مولانا حامد حسن قاری (۲۵ مارچ ۱۸۸۷ء..... ۲ جون ۱۹۶۳ء) بیسویں صدی کی ممتاز علمی و ادبی شخصیت ہیں۔ جنہوں نے اپنے علمی تجربے نہ صرف ہر شعبہ ادب کو متاثر کیا بلکہ اس صدی میں تاریخ، فلسفہ، مذہب اور تصوف کی داستان بھی ان کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گی۔ ان کی شخصیت کی تعمیر میں رام پور اور مراد آباد کی علمی و تہذیبی فضا کا بڑا دخل ہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلابات نے جب زندگی کے ہر دھارے کا رخ موڑ دیا تو فرماں روا نے رام پور کی علمی و ادبی قدردانیوں کی بدولت دہلی، لکھنؤ، آگرہ اور گردونواح کے اہل فن، علما، فضلا اور شاعر، ادیب رام پور میں جمع ہو گئے۔ یوں اس زمانے میں رام پور علم و ادب کا ایک اہم مرکز بن گیا۔

مولانا حامد حسن قادری رام پور کے نزدیک ایک قصبہ پٹھراپوں ضلع مراد آباد (پ۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ پٹھراپوں ایک چھوٹا سا قصبہ تھا لیکن یہاں بڑے جید علما و فضلا اور دین دار بزرگ پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی کوشش و کاوش اور جولانی طبع سے علم و ادب کے میدان اور شعرو سخن میں نئی راہیں استوار کیں۔ پٹھراپوں میں مولانا صاحب کا گھرانہ ممتاز حیثیت کا حامل تھا۔ ان کے والد مولوی احمد حسن اپنے وقت کے ممتاز وکیل، جید عالم اور محدث ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قادر الکلام شاعر اور ماہر تاریخ گو بھی تھے۔ ان کے چچا مولوی محمد حسن فاروقی اسلامیہ کالج پشاور میں صدر شعبہ عربی اور ایک عالم فاضل انسان تھے۔ گویا گھر میں علم و ادب اور تعلیم کا چرچا رہتا۔ اس علمی فضا میں شاعری اور انشا پردازی کی طرف راغب ہونا فطری امر تھا۔ اوپر سے "مدرسہ عالیہ رام پور" جیسے ادارے کی تعلیم نے اس شوق کو دوہا لاکر دیا اور بچپن ہی میں ان کے مضامین و منظومات کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلا مضمون ۱۹۰۲ء میں "انتخاب لا جواب" لاہور میں شائع ہوا۔ پھر رسالہ زمانہ علی گڑھ منتقلی اور مخزن کے لیے مضامین لکھے۔ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے جب ان کی کئی چھوٹی چھوٹی کتابیں شائع ہوئیں۔ اسی زمانے میں ایک انگریزی افسانے کا ترجمہ "جادوگرنی" کے عنوان سے کیا جو "پیہ اخبار" لاہور میں شائع ہوا۔ انھوں نے ابتدا انشاء پردازی

ہے۔ اسٹرلنگ ناتھ کی کتاب ABE Linclon log Cabin to White House کا ترجمہ ”ابراہام لنکن۔ جھوپڑی سے ایوان صدر تک“ اور رابندر ناتھ ٹیگور کی کتاب ”Gardener“ کا ترجمہ ”باغبان“ بھی ترجمہ نگاری کے فن پر ان کی دستگاہ کا ثبوت ہیں۔ بچوں کے لئے لکھا گیا ادب اور ان کے مکاتیب بھی اردو کا قابل فخر سرمایہ ہیں۔ مولانا صاحب کی تصانیف کا سرسری جائزہ اور ان کے علمی کارناموں کا اجمالی ذکر بھی ایک طویل مقالے کا متقاضی ہے لہذا اس بحث سے صرف نظر کرتے ہوئے ”باقیات حامد حسن قادری“ کی طرف آتے ہیں:

”باقیات حامد حسن قادری“ مولانا صاحب کی نثری اور شعری تخلیقات پر مشتمل مجموعہ ہے۔ جن میں سے اکثر مضامین اور منظومات ۱۹۵۱ء تک خیام الفقیر اور اخبار بدیع سکندری میں شائع ہوئیں۔ (حال ہی میں مولانا صاحب کے مقالات اور تاریخ گوئی کے مجموعے بھارت سے شائع ہوئے ہیں لیکن ”باقیات حامد حسن قادری“ کی کوئی تحریر ان میں شامل نہیں ہے)۔ پانچ مضامین اور ایک نظم غیر مطبوعہ ہے۔ نفس مضمون کے اعتبار سے ان تحریروں کو درج ذیل حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

- ۱۔ ادبی مضامین
- ۲۔ علمی و فکری مضامین
- ۳۔ شاعری
- ۴۔ متفرق تحریریں

ادبی مضامین کا حصہ ”حالی اور پیروی مغربی“ کے سلسلہ کے چار مضامین پر مشتمل ہے۔ حالی اور پیروی مغربی کا قصہ یوں ہے کہ اگست ۱۹۴۵ء کے ”زمانہ“ میں معروف ترقی پسند ادیب اور نقاد پروفیسر احتشام حسین کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں انھوں نے مولانا حالی کے اس شعر:

”حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے“

کو بنیاد بنا کر حالی کے ہاں ترقی پسندی کے اثرات کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ جنوری ۱۹۴۶ء کے ”زمانہ“ میں اختر تلمیہی نے ایک مضمون لکھ کر پروفیسر احتشام حسین کی گرفت کی اور ان کے استدلال کو رد کیا۔ اس بنیاد پر ”خیام“ لاہور کے مدیر جناب شبلی بی۔ کام نے اپنے رسالے میں ۸ جون ۱۹۴۶ء ایک مضمون لکھا جس میں انھوں نے بھی احتشام حسین کے خیالات کی تردید کی اور ساتھ ہی اس مسئلے پر اہل قلم سے رائے مانگی۔ اس طرح بحث کا ایک سلسلہ چل نکلا اور مختلف آرا

سے کی لیکن شروع میں ان کا غالب رجحان شاعری کی طرف رہا۔ نظم، غزل، رباعی، مرثیہ، قطعہ، غرض ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی اور تخلیقی جوہر دکھائے۔ مرثیہ سخن، گل صدر برگ اور شور محشر جیسے شعری مجموعے ان کی قادر الکلامی کا بین ثبوت ہیں۔ خاص طور پر تاریخ گوئی میں انھیں بد طولی حاصل تھا۔ انھوں نے فن تاریخ گوئی کی مختلف صنعتوں میں تاریخیں کہیں۔ قرآنی آیات سے نکالی ہوئی تاریخیں دیکھ کر تاریخ گوئی پر ان کے عبور و مہارت اور قدرت و کمال کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ہر طرح کے واقعات کی تاریخ کہنا گویا ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔

شاعری کا فطری ذوق کم تو نہ ہوا لیکن تحقیق و تجسس اور تلاش و تخص کا شوق غالب آیا تو وہ تحقیق و تنقید کے میدان میں جھنڈے گاڑنے چل پڑے۔ تنقید کے میدان میں وہ بڑی حد تک حالی و شبلی کی تنقیدی روایت سے متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ اگرچہ قدیم مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے مگر جدید ادب اور تحریکوں پر بھی گہری نظر تھی۔ انگریزی ادب اور جدید مغربی تنقید کے اصول و نظریات سے واقفیت رکھتے تھے مگر اس کے باوجود ان کی تنقید میں مشرقی اثر نمایاں ہے۔ روزمرہ محاورہ زبان و بیان اور عروض و قواعد کی غلطیوں پر گرفت کیے بغیر نہیں رہتے۔ وہ لگی لپٹی رکھے بغیر تنقید کرتے ہیں۔ ان کی تنقید میں ذاتی تعصب یا بے جا طر فنداری کا عنصر نظر نہیں آتا۔

غالب سے لے کر اپنے عہد کی قریبی شخصیات کے فکر و فن پر لکھتے ہوئے انھوں نے جو جائز تصور کیا کہہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید تنقید ہی رہتی ہے تقریظ کا رنگ اختیار نہیں کرتی۔ ”تاریخ و تنقید“ اور ”نقد و نظر“ جیسی کتابوں میں ان کا تنقیدی شعور بھر پور طریقے سے سامنے آیا ہے۔

تحقیق میں ان کے جس کارنامے کو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی وہ ”داستان تاریخ اردو“ (۱۹۴۱ء) ہے۔ جس کی مقبولیت کا بڑا سبب یہ تھا کہ اس سے پہلے اردو زبان و ادب کی تاریخ پر ایسے شرح و وسط اور تفصیل سے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔

مولانا صاحب اردو کے علاوہ انگریزی، عربی اور فارسی پر بھی کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ اس علمی استعداد کا اظہار انھوں نے تراجم کی صورت میں کیا۔ اگرچہ ترجمے کو طبع زاد تخلیق کے مقابلے میں دوسرے درجے کی چیز سمجھا جاتا ہے لیکن ان کے تراجم سلاست و روانی اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے طبع زاد تخلیق کے درجے تک پہنچے ہوتے ہیں۔ اگر مضمون یا افسانے کے آغاز میں وہ خود نہ بتادیں کہ یہ ترجمہ ہے تو شاید اس کا اندازہ کرنا مشکل ہو جائے کہ یہ تحریر دوسری زبان سے ترجمہ کی گئی ہے اور اس کا ثبوت فارسی کے شہرہ آفاق ادیب سعید نفیسی کے افسانوں کا ترجمہ

سامنے آئیں۔ اصل مسئلہ ”پیروی مغربی“ کی ترکیب کا تھا۔ جس سے مختلف معانی و مطالب اخذ کئے گئے اور اس شعر کی مختلف شرحیں سامنے آئیں۔ اس وقت کے تقریباً تمام قابل ذکر علما اور ادیبوں نے بحث میں حصہ لیا۔ اتفاق بھی ہوا اور تردید بھی۔ اس بحث میں حصہ لینے والوں میں مولانا عبدالمجید ریا بادی، ڈاکٹر سید عبداللہ، مسعود حسن رضوی، ادیب، حسرت نعمانی، سیما اکبر آبادی، نیاز فتح پوری، سر عبدالقادر، حسن نظامی اور جوش ملیح آبادی جیسے قابل ذکر ادیبوں کے علاوہ کئی دوسرے اہم لکھنے والے بھی شامل تھے۔

اس بحث کے نتیجے میں چار مختلف آراء سامنے آئیں۔

اول یہ کہ پیروی مغربی سے مراد ایران کے صوفی شاعر مغربی تبریزی کی پیروی ہے۔ جس کی شاعری کا محور و مرکز تصوف ہے۔ اور مولانا حالی کا خیال یہ تھا کہ میر اور مصحفی کی طرح گل و بلبل اور ہجر وصال کے نغمے گانے کے بجائے شاعری میں صوفیانہ خیالات کو رواج دینا چاہیے۔

دوم یہ کہ ”مغربی“ سے مراد قرطبہ کا معروف مرثیہ گو عربی شاعر ابن زیدون ہے جسے اندلس کی نسبت سے مغربی کہا جاتا ہے اور مولانا حالی چاہتے تھے کہ اب اس قوم کا مرثیہ لکھا جانا چاہیے۔ کیونکہ اصلاح احوال کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

تیسری رائے یہ سامنے آئی کہ مولانا حالی عام زندگی میں اہل مغرب کی تقلید کی ہدایت کر رہے ہیں۔ کیونکہ زمانے کے تقاضے بدل چکے ہیں اور ترقی کی منزل اہل مغرب کے راستے پر چل کر ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

اور چوتھا خیال یہ ظاہر کیا گیا مولانا حالی اردو شاعری میں مغربی انداز فکر کی تلقین کر رہے خاص طور پر غزل کو چھوڑ کر نظم پہنانے کے لیے۔

جہاں تک پہلی رائے کا تعلق ہے مولانا حالی کے سامنے پیروی اور تقلید کے لئے نبی کریم کے اسوۂ حسنہ کے سوا کوئی اور کیونکر قابل ترجیح ہو سکتا تھا۔ یا وہ صحابہ کرام کی تقلید کا ذکر کرتے۔ یہ نہیں تو اسلامی تاریخ میں کئی ایسے جلیل القدر نام مل سکتے ہیں جن کی ذات ایک مسلمان کے لئے لائق پیروی ہے۔ دوسرا یہ کہ مغربی تبریزی صوفی شاعر ضرور ہیں لیکن تصوف کی روایت میں ان کا نام کچھ زیادہ معروف نہیں۔ اگر کسی صوفی شاعر کا ذکر ہی مقصود تھا تو کئی اور نامور صوفی شاعر موجود تھے۔ آخر مغربی تبریزی ہی کیوں؟

اور مغربی اندلسی (ابن زیدون) یا اس کی مرثیہ گوئی کی پیروی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ مولانا حالی قوم کا درد رکھنے والے انسان تھے۔ مسدس میں ان کے ہاں قنوطیت اور مایوسی کا

پہلو کہیں کہیں ضرور نظر آتا ہے لیکن وہ قوم کی حالت سے اس قدر مایوس نہیں تھے کہ اس کا مرثیہ پڑھ بیٹھتے۔ بلکہ ان کے ہاں تو اصلاح اور احیا کا جذبہ تھا۔

تیسری بات یہ کہ عام زندگی اور چال چلن میں اہل مغرب کی پیروی کی ہدایت کر رہے ہیں تو یہ بھی درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ مولانا حالی کی ذاتی زندگی ان کے افکار و خیالات اور کلام سے کہیں بھی یہ تاثر نہیں ملتا حالانکہ وہ سرسید احمد خان کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے لیکن بحیثیت مجموعی اپنی زندگیوں کو مغربی طرز میں ڈھالنے کے ہاں کہیں بھی نظر نہیں آتے۔

رہا سوال اردو شاعری میں طرز مغرب کی پیروی کا تو یہ بات زیادہ قابل قبول نظر آتی ہے۔ اور اس کا بڑا ثبوت انجمن پنجاب کے پبلش فارم سے جدید نظم کے لئے کی گئی مولانا حالی اور آزاد کی عملی کوششیں ہیں۔ ویسے بھی مولانا حالی کا دائرہ عمل زیادہ تر شعر و سخن تک محدود تھا۔ اس طرح حالی اور پیروی مغربی کے سلسلے کی بحث میں سے یہ رائے زیادہ وقیع معلوم ہوتی ہے۔ اور مولانا حامد حسن قادری بھی اسی رائے کے ہاں ہیں۔ ایک بابلغ نظر محقق اور نکتہ رخ نقاد کے طور پر انھوں نے اپنے پہلے مضمون کے آغاز میں ہی اس رائے کا اظہار کیا اور اپنے دلائل و براہین سے اسے ثابت بھی کیا۔ یہ مضمون ان کی بابلغ نظری اور تنقیدی شعور کا واضح ثبوت ہے۔

”باقیات حامد حسن قادری“ کا دوسرا حصہ علمی و فکری مضامین پر مشتمل ہے۔ جس میں مولانا صاحب کا مذہب سے لگاؤ، دین سے محبت اور قومی زندگی کے معاملات میں مذہب کی اہمیت و افادیت کا شعور و احساس غالب نظر آتا ہے۔

اس حصے کا پہلا مضمون ”عالمگیری نسخہ قرآن مجید اور اس کے اغلاط کتابت“ ہے۔ مغل فرماں روا اورنگ زیب عالمگیر کتابت قرآن مجید کے حوالے سے خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے ایک قلمی نسخہ قرآن مجید کو خواجہ حسن نظامی نے چھپوایا جس میں کئی مقامات پر کتابت کی غلطیاں تھیں۔ مولانا صاحب نے ان اغلاط کی نشاندہی کی اور ساتھ صحیح آیات بھی درج کیں۔ یہ مضمون دو حصوں پر مشتمل تھا جو ”اخبار بدیع سکندری“ اور ”خیام“ میں شائع ہوا۔ ان دونوں حصوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ نفس مضمون ایک ہی ہے اس لئے بعض مقامات پر جزوی اشتراک ہے۔ یہ مضمون مولانا صاحب کے علمی تجربہ کا کھلا ثبوت ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے جو اپنے کلام کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا ہے تو وہ اس کی حفاظت کا بند و بست ایسی بزرگ ہستیوں کے ذریعے ہی فرماتا ہے۔ مجھے فخر محسوس ہو رہا ہے کہ ایسے مضمون کو بار درگوش کرنے کی سعادت میرے حصے میں آ رہی ہے۔

اس حصے کا دوسرا مضمون ”حضرت سلیمان اور ان کے گھوڑے“ ہے۔ جو دراصل شبلی بی۔ کام

کے اس مضمون کا جواب ہے۔ جس میں انھوں نے قرآنی آیات کی روشنی میں حضرت سلیمان کے گھوڑوں کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ مولانا صاحب نے انتہائی شرح و بسط سے ان آیات قرآنی کا صحیح مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

”شاید مبشر۔ نذیر“ ایسا مضمون ہے جس میں اس آیت قرآنی کی تعبیر و تفسیر پر بحث کی گئی ہے جس میں رب ذوالجلال نے اپنے محبوب حقیقی کو شاید۔ مبشر اور نذیر کے ناموں سے پکارا ہے۔ اس کی توصیف و توضیح کے لئے مولانا صاحب نے معروف فقیہ، محدث، واعظ اور مفسر قرآن علامہ ابن جوزی کی تفسیر سے حوالے دیے ہیں۔

انگریزی تہذیب کے اثرات نے جہاں ہر شعبہ زندگی کو متاثر کیا وہاں تعلیم کو بھی دو خانوں میں بانٹ دیا۔ دنیاوی تعلیم اور مذہبی تعلیم کو مکمل طور پر الگ کر دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں قدامت پسند طبقہ قدیم علوم سے چٹا رہا اور دوسرے طبقے نے جدید علوم کی تحصیل ہی کو زندگی کا منہ بنائے مقصود جان کر علوم قدیمہ کو فرسودہ اور بے کار قرار دے دیا۔ توازن کا راستہ کیسے تلاش کیا جائے؟ یہ سوالیہ نشان آج بھی موجود ہے۔ یہ مسئلہ نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کو بلکہ پوری مسلم امہ کو درپیش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں خاص طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کی انفرادی، خانگی اور جماعتی زندگی بے سکونی کا شکار نظر آتی ہے۔ مولانا صاحب کے نزدیک اس کا بڑا سبب مذہبی تعلیم اور مذہبی زندگی کا فقدان ہے۔ ”دینی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کی ضرورت“ میں انھوں نے اس مسئلہ پر بھرپور اظہار خیال کیا ہے اور اپنے دلائل کو قرآن و حدیث کی مدد سے تقویت پہنچائی ہے۔

”اسوۂ حسنہ“ معروف نو مسلم مستشرق علامہ محمد اسد (لیوپولڈ ویس) کے مضمون کا ترجمہ ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے اسلام قبول کرنے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے اسلامی نظام زندگی کو بہترین نظام اور تعلیمات نبوی کو انسانی تاریخ کی سب سے بہترین تعلیم قرار دیا ہے۔ سلاست و روانی اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے یہ ترجمہ بے مثل ہے۔

”پردہ ایک تعارف“ کا موضوع شرم و حیا اور پردہ جیسی اخلاقی اقدار ہیں۔ اس مضمون میں فارسی اشعار کی بھرمار ہے۔ اردو نثر کم اور بیدل کے فارسی اشعار زیادہ ہیں۔ بہر حال یہ مضمون مولانا صاحب کے علمی تجر اور فارسی دانی کا بہترین ثبوت ہے۔

”آئینہ حرم“ اصغری بیگم کے مضمون (مطبوعہ ۲۰ فروری ۱۹۳۹ء اخبار دبدبہ سکندری) کا جواب ہے جس میں انھوں نے موجودہ عہد میں مردوں کی حالت زار پر طنز کرتے ہوئے آزادی نسوان کی آواز بلند کی اور پردہ کو غیر ضروری قرار دیا۔ مولانا صاحب نے اسلامی قوانین اور

معاشرتی اقدار کی روشنی میں اس مضمون کا انتہائی مدلل جواب دیا ہے۔ اس نازک مسئلے پر بحث کرتے ہوئے ان کا اسلوب کسی قسم کے تعصب یا جذباتیت سے پاک رہتا ہے۔

”ہم رونے پہ آجائیں.....“ میں قوم کی حالت زار اور تعلیمی تنزل کا رونا رویا گیا ہے۔ یہ دراصل کسی سکول کے جلسے میں کی گئی تقریر کا متن ہے۔ اور غیر مطبوعہ ہے ممکن ہے دوران تقریر نقل کیا گیا ہو۔ اس مسودے کا کاغذ پرانا اور بوسیدہ ہے۔ کاتب کا خط شکستہ ہے۔ شاید جلدی میں لکھنے کی وجہ سے روشنائی پھٹکی ہے اور بعض جگہوں پر تو لفظ بالکل معدوم ہو چکے ہیں۔ بعض مقامات کرم خوردہ بھی ہیں۔ ان وجوہات کی بنا پر اس کی خواندگی میرے لئے بہت مشکل ثابت ہوئی۔ بعض مخطوطہ شناس حضرات سے بھی رابطہ کیا مگر اس کے باوجود کچھ مقامات ناخواندہ ہی رہے۔ اس متن کا کوئی دوسرا نسخہ مطبوعہ یا غیر مطبوعہ بھی دستیاب نہ ہو سکا۔ لہذا جن مقامات پر تحریر کو پڑھنا ناممکن تھا وہاں قیاس سے کام لیا گیا ہے اور جہاں قیاس سے بھی کام نہ چلا تو اس جگہ کو خالی چھوڑ دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مضمون کے تسلسل یا نفس مضمون کے فہم میں کوئی خاص مشکل نہیں۔

تیسرا حصہ شاعری کا ہے۔ ”تعبیر ارشادات قرآنی“ میں مولانا صاحب نے مختلف قرآنی آیات اور ان کے مغایہم کو قطعاً میں بیان کیا ہے۔ دو نظمیں ”حالی اور پیروی مغربی“ کے سلسلے (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) کی ہیں۔ جو منظوم تنقید ہیں۔ جن میں سے ایک نظم غیر مطبوعہ ہے اور اس پر ۹ ستمبر ۱۹۳۶ء کی تاریخ درج ہے۔ دوسری نظم ستمبر ۱۹۳۶ء کے ”خیام“ میں شائع ہوئی۔ ان کے علاوہ ایک تضمین اور دوسری نظمیں اور مختلف قطعاً تاریخ ہیں جن میں مختلف واقعات کی تاریخیں ہیں۔

متفرق تحریروں کے حصے میں مدیر کے نام شائع شدہ خطوط مختلف شاعروں کے کلام پر تبصرہ اور اپنے مضامین پر اعتراضات کے جوابات ہیں۔ ان تحریروں میں مذہبی و فقہی مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ لیکن مولانا صاحب کا انداز مدلل اسلوب سلجھا ہوا اور تعصب اور جذباتی پن سے پاک ہے۔

☆☆

ترتیب متن کے ضمن میں املاء کا مسئلہ ہمیشہ سے اہم رہا ہے۔ اس بارے میں مختلف محققین کی آرا مختلف ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ متن چونکہ مصنف کی ملکیت ہوتا ہے اس لئے منشاء مصنف کو مقدم رکھتے ہوئے اصل املاء کو برقرار رکھنا چاہیے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ وقت کے ساتھ اس متن کا قاری بدل جاتا ہے۔ اگر موجودہ عہد کے قاری کے سامنے یہ متن پیش کرنا ہے تو اس کا املاء بھی آج کا ہونا چاہئے تاکہ قاری کے لئے اس کی تفہیم آسان رہے۔ ذاتی طور پر مجھے یہ رائے زیادہ

قابل قبول نظر آتی ہے۔

”باقیات حامد حسن قادری“ کی اکثر تحریریں ۱۹۵۱ء تک کی مطبوعہ ہیں۔ اور تقریباً نصف صدی کے اس عرصے میں اردو کے املاء نے اپنا روپ زیادہ نہیں بدلا، سوائے چند لفظوں کے۔ مطبوعہ تحریروں میں یہی صورت نظر آئی اور غیر مطبوعہ تحریروں میں بھی املاء کی صورت اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ لہذا باقیات حامد حسن قادری کی ترتیب و تدوین کے وقت چند لفظوں کے املاء کو جدید املاء کے مطابق کر دیا ہے۔ ایسے لفظ اور ان کے تبدیل شدہ املاء کی فہرست ذیل میں دے دی گئی ہے۔ تمام الفاظ کی فہرست نہیں دی۔ جن لفظوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے قبیل کے دوسرے الفاظ کے املاء کو بھی تبدیل شدہ تصور کیا جائے:

پرائی صورت	تبدیل شدہ صورت	پرائی صورت	تبدیل شدہ صورت
نہ	ہے	یہہ	یہ
پہر	پھر	گہر	گھر
بہی	بھی	پہو نچے	پہنچے
اوس	اس	کچہ	کچھ
مچے	مجھے	تہی	تھے
کیسے	کس نے	نہو	نہ ہو

آخر میں مجھے شکریہ ادا کرنا ہے مولانا صاحب کے فرزند ارجمند جناب خالد حسن قادری کا جنہوں نے لندن سے مسودات فراہم کئے اور استاد مکرم جناب ڈاکٹر وحید قریشی کا جن کی صحبتوں کے طفیل یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ رہا ہے۔

اورنگ زیب نیازی

۲۰/ اکتوبر ۲۰۰۵

حالی اور پیروی مغربی (۱)

(آگرہ ۸ جولائی)

محبت مکرم۔ السلام علیکم

پھر ایوں سے میرا کارڈ پہنچا ہوگا۔ میں یکم جولائی کو واپس آ گیا۔ اس کارڈ کے روانہ کرنے کے بعد وطن میں اتفاق سے مولوی سعید احمد صاحب اکبر آبادی مدبر ”برہان“ دہلی سے ملاقات ہو گئی۔ مولوی سعید احمد صاحب نے باتوں باتوں میں خود ہی کہا کہ آج کل ایک بحث ”مغربی“ کے متعلق چل رہی ہے آپ کی نظر سے گزری ہوگی۔ میں نے کہا کہ میں دو ڈیڑھ مہینے سے پنجاب کے سفر میں تھا اور ایک ایسے گاؤں میں قیام تھا جہاں اس طرح کا کوئی اخبار رسالہ نہ آتا تھا۔ اس لئے میں اب تک اس بحث سے بے خبر ہوں۔ پھر میں نے آپ کا نام لیا کہ کبھی صاحب کا خط ملا تھا۔ انھوں نے اشارہ کیا تھا۔ مگر میں کچھ سمجھا نہیں۔ مولوی سعید صاحب نے کہا کہ حالی کے اس شعر پر بحث چل رہی ہے:

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں

بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

بعض نقاد کہتے ہیں کہ ”پیروی مغربی“ سے پیروی مغرب شاعری جدید میں مراد ہے اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مغربی شاعر ایرانی کی پیروی مقصود ہے۔

میں نے فوراً کہا کہ آپ میری رائے سن لیجیے۔ حالی کا مدعا پیروی مغرب ہے مصحفی و میر کی عاشقانہ شاعری کے ترک اور طرز یورپ و نظم انگریزی کی تقلید کی ہدایت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی مطلب نہیں ہو سکتا۔ مجھے اس امر میں بقول غالب نفس مطمئنہ حاصل ہے۔ کسی شاعر ایرانی مغربی تخلص کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ جو حضرات مغربی تہریزی مراد لیتے ہیں سمجھ لیجیے کہ ان کے دماغ میں ٹیڑھ ہے۔

اب آگرے آکر پہلے آپ کا اور پھر احتشام صاحب کا مضمون بڑی دلچسپی سے پڑھا۔

۸ جولائی کے خیام میں آٹھ نقادوں کے خطوط و تبصرات بھی دیکھے اور بہت لطف آیا۔ سب

سے بڑی دل لگی یہ ہے کہ آپ نے ایک ذرا سی دیاسلائی جلا کر لوگوں کے دماغوں کی تہوں کو روشن کر دیا ہے اور ان کے ذوق و شعور پر سے پردہ اٹھا دیا ہے۔ حالی کا شعر کوئی ایسا شعر نہ تھا کہ بیک نظر اور اندرون یک لمحہ سمجھ میں نہ آ سکتا۔ احتشام صاحب کی طرح حالی کے شعور کے اندر ڈوبنے اور تیرنے کی ضرورت نہیں۔ ساحل پر رکھی ہوئی چیز ہے۔ نگاہ ذوق کے پڑنے کی دیر ہے۔

کم سے کم مجھے اس مسئلہ میں کسی تحقیق و تدقیق کی ضرورت نظر نہیں آتی۔ ہر شعر کے سمجھنے کے لئے عربی و فارسی اور لغات و تذکرات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلاشبہ میں خود بھی سمجھنے میں غلطی کرتا ہوں اور کر سکتا ہوں مگر کم سے کم اس مسئلہ میں وہی غالب کی نفس مطمئنہ والی بات ہے۔

مسئلہ صرف اتنا ہے کہ جدید شاعری مراد لے کر حالی کو ذوق سلیم کا حامل گردانا جائے اور ”پیروی مغربی“ کی ترکیب غلط کو ان کا سہو یا بے پروائی سمجھا جائے۔ یا اس کے برعکس ترکیب فارسی کو صحیح مانا جائے اور ”مغربی شاعر“ سمجھ کر حالی کے مذاق صحیح پر داغ لگایا جائے۔

میرے نزدیک یقیناً پہلی صورت ہے اور یہی ہونی چاہیے۔ حالی میر و مصحفی کے مقابلے میں مغربی تبریزی کو پیش نہیں کر سکتے تھے۔ مغربی شاعر مطلقاً مشہور نہیں کہ میر و مصحفی کی طرح نام سننے ہی ہر شخص سمجھ جائے اور لطف اٹھائے۔ مغربی کی صوفیانہ شاعری ایسی نہیں کہ رومی، عطار، خسرو، جامی کو چھوڑ کر اس کا نام لیا جاتا۔ حالی خود صوفیانہ شاعر نہیں کہ اس کی تبلیغ کرتے اور ترغیب دیتے۔ حالی نے کہاں کہاں مغربی یا کسی مصوف میں تصوف خال خال ہی ہے۔

اس کے مقابلے میں جدید شاعری کے حالی بڑے مبلغ اور عالم باعمل تھے۔ اپنی عمر کے آخری چالیس سال میں ۱۸۷۴ء سے ۱۹۱۴ء تک انہوں نے نیچرل قومی اخلاقی نظمیں، غزلوں سے بہت زیادہ لکھی ہیں اور اعلان کر دیا ہے:

جب سے دل زندہ ٹو نے ہم کو چھوڑا

ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

اب صرف پیروی مغربی کی ترکیب رہ جاتی ہے۔ حالی کو اپنے مفہوم کے لئے پیروی مغرب کہنا چاہیے تھا۔ مگر مصرع اس طرح سے بے تکلف بن گیا۔ انھوں نے ترکیب کو جائز کر لیا اور جائز ہو بھی سکتی ہے۔ اگر حالی کے ساتھ کچھ رعایت کی جائے اور ان کو کڑا نہ پکڑا جائے۔ مثلاً کہہ سکتے ہیں کہ ”فلاس مسئلہ اقتدائے خفی سے متعلق ہے۔“ یعنی امام ابو حنیفہ کے مذہب کی پیروی۔ اسی طرح ”پیروی مغربی“ یعنی طرز و افکار مغرب کی پیروی۔ بلاشبہ ”پیروی مغرب“ کی جگہ

”پیروی مغربی“ کہنا بات کو پھیر سے کہنا ہے۔ لیکن یہ بات کا پھیر ذوق سلیم کے اس اندھیرے سے بہتر ہے اور انتہا کی بات یہ ہے کہ حالی کی ترکیب کو غلط مان لیجیے۔ انھوں نے یہ پہلی غلطی نہیں کی ہے۔ زبان، محاورہ، بیان، عروض وغیرہ میں بہت سی غلطیاں کی ہیں۔ ایک یہ بھی سہی۔ لیکن حالی ایسے بد مذاق نہ تھے کہ مغربی تبریزی مراد لیتے۔ شاعری میں اصل چیز لفظوں کی صحت نہیں مفہوم کی صحت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی شاعر سراسر یا اعتدال سے زیادہ غلط زبان لکھے اور کراہت و قتل کی حد تک پہنچ جائے۔ حالی کی شاعری میں ایسی صورت نہیں ہے۔

۸ جولائی کے خیام میں جن آٹھ نقادوں کی رائے شائع ہوئی ہے۔ ان میں سیماب صاحب میں مذاق سلیم کی کمی ہے۔ ماہر القادری صاحب اور نواب اثر لکھنوی صاحب ترقی پسندوں اور نئے ادیبوں کے نام اور تذکرے سے بیزار رہتے ہیں۔ یہاں بھی ماہر و اثر میں دونوں نے اپنے ذوق کو تکلیف نہیں دی۔ یہ دیکھ کر کہ اس بحث میں ترقی پسند حضرات شریک ہیں کانوں پر ہاتھ دھر لیے۔ ماہر و اثر صاحب نے اس شعر اور بحث کے متعلق صاف رائے نہیں لکھی مگر ان کا مقصود یہی معلوم ہوتا ہے کہ حالی نے مغربی تبریزی کی پیروی کی ہدایت کی ہے لیکن اس رائے کا اثر صاحب سے تعجب ہے۔ وہ شاعری اور تنقید کرتے کرتے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ مہر محمد خان صاحب شہاب کا جواب بالکل درست ہے۔ اس پر کسی اضافے کی گنجائش نہیں۔ پروفیسر تلوک چند صاحب محروم اگر اب بھی اسی مفہوم پر قائم ہیں کہ مغربی کی پیروی کریں یعنی تصوف اور معرفت میں شعر کہیں تو ان کو بھی سیماب صاحب کے گروہ میں شامل سمجھیے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے خدا جانے کیوں لیت و حل سے کام لیا؟

اس مسئلہ میں فیصلے کے لئے پہاڑ پر جانے یا میدان میں رہنے سے کیا تعلق۔ نصف کالم کا خط لکھنے کی فرصت تو آخر پہاڑ سے نیچے بھی تھی ہی۔ اتنی سطروں کی جگہ ایک دو سطر میں اپنی رائے لکھ سکتے تھے مگر ان کو اپنے پر اعتماد نہ تھا۔ اور آپ کے مضمون یا دوسروں کی رائے سے مرعوب ہو گئے۔ معین الدین صاحب ندوی نے یہ پہلو خوب پیدا کیا بطور ایہام کہ مغربی تبریزی کا نام لیا گیا ہے۔ اصل مقصود مغربی شاعری اور مغربی خیالات کی تقلید ہے۔ اس نکتہ میں مضائقہ نہیں دیکھیے علامہ اقبال نے طلوع اسلام میں ایسا ہی ایہام پیدا کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

ربود آں ترک شیرازی دل تیریز و کابل را

صبا کرتی ہے بُوئے گل سے اپنا مسفر پیدا

یہاں ”ترک شیرازی“ سے ترکوں کی قوم مراد ہے۔

بہر حال یہ بحث دلچسپ ہے۔ آپ رانیں منگا کر شائع کیے جائیے۔ اور تمام مضامین و خطوط جمع کرتے رہیے۔ جب سلسلہ ختم ہو جائے تو اس کو کتابی صورت میں شائع کر دیجیے اور اس پر کسی سے محاکمہ و مقدمہ لکھوایئے۔ یادگار رہے گی۔ اس بحث میں بڑے بڑے دماغ شامل ہیں۔ ان کی کئی یادداشتی پتھر کی لکیر بن جائے گی اور آئندہ نسلیں سب کی ”لوہ مزار“ کو پڑھا کریں گی۔ اور مزے لیا کریں گی۔

(والسلام)

احقر حامد حسن قادری

خیام لاہور یکم اگست ۱۹۴۶

☆☆

(۲)

(مکرمی! السلام علیکم)

میر الفافہ پہنچا ہوگا۔ آج پھر اس لئے لکھتا ہوں کہ ۲۳ اگست کے خیام میں ”پیروی مغربی“ کی بحث میں بعض دوسری ضمنی باتیں دلچسپ نظر آئیں۔ پہلے بھی بعض صاحبوں نے اس بحث کے دوران میں دوسرے مباحث چھیڑ دیئے ہیں۔ اس طرح کے تبصروں پر بھی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً بعض حضرات نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ مولانا حالی تمدن، معاشرت، افکار و ادبیات سب میں انگریز اور یورپ کی تقلید کو پسند کرتے تھے۔ حالانکہ یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ حالی سرسید کی طرح انگریز پرست نہ تھے۔ اور اس شعر کی بحث میں تو اس تذکرے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہاں اگر ”پیروی مغربی“ مراد ہے تو صرف نظم میں ہے۔ تمدن و معاشرت سے اس شعر کو کچھ تعلق نہیں۔ یا مثلاً جناب ناطق گلٹھوی نے ”مسدس حالی“ کے متعلق یہ عجیب بات لکھ دی ہے:

”مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس سی سالہ محنت کے شاہکار میں

مولانا حالی کی کوشش کتنی ہے اور آہی مغفور کی کاہش کتنی۔“

کیا ان کا یہ مطلب ہے کہ مسدس حالی تھوڑا سا تو مولانا حالی نے لکھا اور باقی سرسید نے (جن کا تخلص آہی تھا) لکھا۔ کوشش و کاہش سے ناطق صاحب کا کیا مقصود ہے سرسید ایسے شاعر نہ تھے کہ یہ مسدس تصنیف کر سکتے۔

۲۳ اگست کے خیام میں آپ نے نیاز صاحب فقہوری کا تبصرہ نقل کیا ہے اس میں نیاز صاحب نے مسدس حالی کے پہلے بند پر اعتراض کیا ہے۔ ”نگار“ میرے پاس نہیں ہے۔ مگر آپ نے یہ بند جس طرح نقل کیا ہے۔ اس کے دوسرے شعر میں حالی کے شعر سے اختلاف ہے۔ اور اختلاف الفاظ کے علاوہ آپ کی نقل میں ایک عیب پیدا ہو گیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

وہ بولا نہیں ہے کوئی مرض ایسا

خدا نے دوا جس کی کی ہو نہ پیدا

”مرض“ نبوزن ”قرض“ پڑھا جاتا ہے۔ یعنی بسکون اوسط۔ اور یہ غلط ہے۔ کاتب خیام کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

نیاز صاحب نے اس مصرع کو اس طرح لکھا ہوگا:

”وہ بولا نہیں ہے مرض کوئی ایسا“

لیکن مولانا حالی کا اصلی شعر یہ ہے:

کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا

کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا

نیاز صاحب کا اعتراض یہ ہے کہ اس ٹیپ کے دونوں مصرعے باہم مربوط نہیں:

مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں

کہے جو طیب اس کو ہذیان سمجھیں

نیاز صاحب کہتے ہیں کہ ”دوسرے مصرع کا تعلق مرض سے نہیں مریض سے ہے۔“ مگر یہ عجیب اعتراض ہے۔ اگر مرض سے تعلق نہیں مریض سے ہے۔ جب بھی ربط موجود ہے۔ مرض اور مریض میں باہم برا تعلق ہوتا ہے لیکن یہاں تو دوسرا مصرع مرض اور مریض دونوں سے متعلق ہے۔ انہوں نے ”سمجھیں“ کے لفظ پر توجہ نہیں کی۔ اس کا فاعل مریض لوگ ہیں اس شعر کی نثر یہ ہو گی: مگر وہ مرض (لا علاج ہے) جس کو مریض آسان سمجھیں اور طیب جو کچھ کہے اس کو ہذیان سمجھیں۔ دیکھیے کیا ربط قائم ہے۔

نیاز صاحب کا دوسرا اعتراض صحیح ہے۔ مولانا حالی کے اس مصرع میں ”وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا“ نبی کی جمع نئیوں (بسکون یا) نظم ہوئی ہے۔ نیاز صاحب نے اس کو غلط بتایا ہے اور یہ پیشک غلط ہے۔ سیما صاحب اکبر آبادی نے اپنے خط میں (اسی خیام میں) اس جمع کو درست ثابت کرنے کے لئے جو مثالیں دی ہیں وہ منطبق نہیں ہیں۔ سیما صاحب نے نبی، سخی، کلی، رشی کو یکساں سمجھ لیا۔ حالانکہ یہ تین قسم کے الفاظ ہیں۔ ان کی نظر سے یہ بات رہ گئی کہ نبی میں (ی) پر تشدید ہے۔ سخی، صدی وغیرہ میں نہیں ہے۔ بلکہ ”سخی“ کا لفظ سیما صاحب نے غلطی سے شامل کر دیا ہے۔ یہ دوسرے الفاظ کے ہم وزن نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ع ساکن ہے۔ اس لئے اس کی جمع میں لامحالہ دوسرا حرف ساکن ہوگا۔ باقی دوسرے الفاظ صدی، بدی، کلی، گلی وغیرہ میں چونکہ یاے مشد نہیں ہے۔ اس لئے واؤ نون سے جمع بنانے میں دوسرے حرف کو ساکن کر دیتے ہیں۔ لیکن نبی، ولی، مدعی کی جمع میں یاے مشدہ کا اظہار ضروری ہے۔ سہ حرفی الفاظ ولی، نبی

میں تو اگر حرف ثانی کو ساکن کر دیں گے تو یاے مشدہ کا تلفظ ممکن ہی نہیں ہے۔ نبی میں جب یاے نسبت بڑھائی جاتی ہے۔ تو اس وقت ب متحرک ہی رہتی ہے۔ اگرچہ وہ حرکت زیر سے زبر ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کا ساکن کرنا جائز نہیں۔ یعنی نبوی کو سکون حرف دوم کے ساتھ فعلن کے وزن پر نظم کرنا غلط ہے۔ حتیٰ بھی عربی لفظ ہے اور اس میں یاے مشدہ د ہے۔ اس لئے اس کی جمع میں بھی یہی صورت ہے۔

سیما صاحب نے اپنے خط میں بھی یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اگر مولانا حالی مرحوم کو ”پیروی مغربی“ سے ”پیروی مغرب“ مراد لینی تھی۔ تو یہی لفظ یا اس کے ہم معنی الفاظ کا نظم کر دینا کوئی دشوار بات نہ تھی اور دشوار نہ ہونے کے ثبوت میں دس مصرعے تصنیف فرما کر پیش کئے ہیں۔ اور عدم فرصت کی بنا پر انھی پر اکتفا کی ہے۔ کاش ان کو فرصت ہوتی اور دس نہیں ہیں بلکہ چالیس مصرعے پیش کرتے۔ بلاشبہ نہ سیما صاحب کے لئے کوئی دشوار بات ہے نہ مولانا حالی کے لئے تھی۔ مگر اتنی سی بات ہے کہ جو بے ساختگی و بزرگسنگی حالی کے اس مصرع میں ہے:

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں

وہ سیما صاحب کے دس مصرعوں میں بھی نہیں ہے اور میں چالیس اور اسی مصرعوں میں سے بھی کسی میں نہیں ہو سکتی۔ سیما صاحب خود اور عام ناظرین حالی کے مصرع کے ساتھ ان دس مصرعوں کو پڑھ کر غور فرمائیں۔ معاً محسوس ہوتا ہے کہ حالی کا مصرع بہت بے تکلف ہے۔ سیما صاحب کے مصرعوں میں صرف مصرعہ نم:

”حالی کریں گے آج سے مغرب کی پیروی“

دوسروں سے بہتر ہے۔ باقی سب کسی نہ کسی وجہ سے بندش میں درست یا خوبصورت نہیں رہے۔ اس کا سبب میں عرض کرتا ہوں۔ سیما صاحب نے پانچ مصرعوں میں ”مغربی“ کا لفظ اور ایک مصرع میں ”پیروی“ کا لفظ اس طرح نظم کیا ہے کہ آخری ’ی‘ ساقط ہے صرف ’ی‘ کے ماقبل کی حرکت پڑھی جاتی اور تقطیع میں آتی ہے۔ اور اس ’ی‘ کا دبنا یا گرنا بندش کوست کر دیتا ہے۔ باقی تین مصرعوں میں یہ عیب نہیں ہے لیکن نظم و بندش کی خامیاں ہیں۔ حالی کے مصرع کی سی آمد کسی میں نہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ”اقتدائے مصحفی و میر“ کے مقابلے میں ایسی ہی فارسی ترکیب ہونی چاہیے اور وہ ”پیروی مغربی“ تھی لیکن یہ ترکیب اس مصرع میں بہت ہی دشواری سے نظم ہو سکتی ہے۔ اسی لئے سیما صاحب نے ایک مصرع میں بھی ”پیروی مغرب“ کی ترکیب نہیں لکھی۔ ان الفاظ کے بعد جو لفظ آئے گا اس کا الف سے شروع ہونا ضروری ہے۔ اس وجہ سے بندش عمدہ

نہیں رہتی۔

تاہم حالی اس پر مجبور نہ تھے کہ خواہ مضمون غلط ہو جائے لیکن لکھیں تو فارسی ترکیب ہی میں لکھیں۔ ان کو درست اور واضح الفاظ لکھنے چاہئیں تھے۔ خواہ اردو کی اضافت ہوتی یا فارسی کی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے یا تو یہ سب تجربات کیے جو سیماب صاحب نے کیے اور کسی مصرع کو برجستہ و شگفتہ نہ پا کر ”پیروی مغربی“ کے ساتھ مصرع کو نظم کر لیا یا ”پیروی مغرب“ کے الفاظ ذہن میں آتے ہی بغیر مشق و تجربہ کے بندش کا عیب نظر آ گیا اور ”مغرب“ کی جگہ ”مغربی“ کو بضرورت شعری جائز کر لیا۔

خیر یہ مصرع تو جس طرح بنا ہوا لیکن ذرا اس بات پر پھر غور کر لیجئے کہ اگر مولانا حالی مغربی شاعر تبریزی کی پیروی چاہتے ہیں۔ تو کس قدر عجیب بات ہے کہ جس بات کا اعلان کر رہے ہیں ہدایت کر رہے ہیں اس پر خود مطلقاً عمل نہیں کرتے۔ شعرائے متوفین میں سے اس شاعر کا انتخاب کرتے ہیں جس نے وحدت الوجود کے سوا کچھ نہیں لکھا۔ اور مولانا خود غزلوں میں سب کچھ لکھتے ہیں لیکن وحدت الوجود ہی نہیں لکھتے۔ یہ مضمون و موضوع تو دیوان حالی میں ”خال خال“ سے بھی کم ہے۔ گویا مولانا حالی (معاذ اللہ) ان آیات کے مصداق ہیں: یَفْقَهُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ^۱ (وہ بات کہتے ہیں جو کرتے نہیں) فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّهْمُوْنَ^۲ (ہر وادی میں سرگرداں ہیں) مولانا حالی اول خود عمل کرنے والے اور پھر دوسروں کو نصیحت کرنے والے آدمی تھے۔ چنانچہ انہوں نے انگریزی ادب کو ترجموں کے ذریعہ سے مطالعہ کیا۔ اس کی خوبیاں ذہن نشین کیں ان کو اپنی نظم و نثر میں برتاؤ اور پھر اعلان کیا۔ ہدایت کی۔ ترغیب دی۔

(خیام لاہور ۱۶ ستمبر ۱۹۳۶ء)

☆☆

(۳)

(مولانا حالی کی آزادیاں)

مولانا حالی کی عیب جوئی مقصود نہیں بلکہ دکھانا ہے کہ مولانا باطلع شاعری میں آزادی پسند تھے۔ اپنی غزل گوئی کے زمانے میں بھی وہ کچھ بہت اصول و ضوابط کے پابند نہ تھے۔ پھر جب سے طرز جدید کی نظمیں شروع کیں اور مسدس لکھا رہی سہی پابندیاں بھی اٹھنے لگیں اور وہ روانی، صفائی، بے ساختگی، ادائے مفہوم کو الفاظ و تراکیب کی صحت و باضابطگی پر مقدم رکھنے لگے۔ جب ضرورت سمجھی، قافیہ کے اصول توڑ دیے۔ الفاظ کو عوام کے تلفظ کے مطابق نظم کر دیا۔ قلیل الاستعمال محاورے لکھ دیئے ہندی کے متروک الفاظ صرف کر دیئے۔ بعض مثالیں دیکھیے:-

(۱) مسدس حالی کی ایک ٹیپ ہے:

منو نے یہ ایمان و اشراف کے ہیں

سلف ان کے وہ تھے خلف ان کے یہ ہیں

اس میں ”کے“ ”یہ“ قافیہ ہیں۔ لیکن صحیح اس وقت ہو سکتے ہیں جب ”یہ“ کو ”یے“ لکھا جائے اور یہ غلط ہے۔ مگر یہ غلطی کیوں گوارا کی؟ بات یہ ہے کہ دوسرا مصرع نہایت خوبصورت اور بے ساختہ تھا مگر اس میں آخر کے چار الفاظ ”ان کے“ ”یہ“ ہیں۔ میں سے ایک بھی قافیہ ہو سکتا تھا۔ پھر قافیہ ہوتا تو ”خلف“ ہوتا۔ اس کا ہم قافیہ مصرع اولیٰ بے تکلف نہ رہتا۔ اس لئے مولانا حالی نے اصول قافیہ کی پرواہ نہ کی اور ”کے“ ”یہ“ قافیہ کر دیے۔

(۲) مسدس کی ایک اور ٹیپ ہے:

بس اب اپنی گردن پہ رکھو بجا تم

کرو حاجتیں آپ اپنی روا تم

”بجا“ اور ”روا“ قافیہ غلط ہیں۔

(۳) ایک بند کے چار مصرعوں میں یہ قافیہ ہیں:- مستنصریہ، صاحبیہ، قاہریہ، ناصرہ۔

قاعدہ یہ ہے کہ جب تین قافیوں میں ”رائے مہملہ“ کی قید ہے تو چوتھا قافیہ بھی ایسا ہی ہونا چاہئے۔ لیکن یہاں صورت حال یہ ہے کہ چاروں مصرعوں میں صرف مدارس قدیمہ کے نام ہی نام ہیں اور کوئی لفظ نہیں۔ اب چوتھا نام ”رے“ والا نہ تھا تو مولانا حالی کہاں سے پیدا کر دیتے؟ کیا اس خیالی ضابطہ کی وجہ سے اس بند کو اڑ دیتے۔ نہیں انہوں نے قید و بندی کو اڑا دیا۔

(۴) مسدس کی ایک اور ٹیپ ہے:

ہو اس طرح ہاتھوں میں اس کے رعیت

کہ قبضے میں غنٹال کے چسے نہت

”رعیت“ میں یاے مشدد پر زبر صحیح ہے اور ”میت“ میں زیر صحیح ہے۔ اس لئے قافیہ نہیں ہو سکتے۔ لیکن عام طور پر ”میت“ کو زبر سے بولتے ہیں۔ اسی تلفظ کا اتباع مولانا نے بھی کیا ہے۔

(۵) مسدس کے ان مصرعوں کو دیکھیے:

رعیت کی ہے واں نپٹ بے حیائی

نہ قانون بھٹ کار فرما ہو کوئی

ہندی کے یہ الفاظ مسدس حالی کے زمانے میں متروک ہو چکے تھے۔ لیکن مولانا نے لکھ دیے اور صرف یہ الفاظ ہی نہیں ایسے بہت سے ہندی کے الفاظ اپنی نظموں میں بے تکلف لاتے ہیں اور ایمان کی بات یہ ہے کہ میں ان کو نہایت معنی خیز، موزوں اور خوبصورت سمجھتا ہوں۔ آخر ہندی سے ایسی بیزاری کیوں ہو؟

مولانا حالی کی اس آزادہ روی سے کیا بعید ہے کہ انہوں نے ”پیروی مغرب“ کی جگہ ”پیروی مغربی“ بھی لکھ دیا ہو۔ اس لئے کہ ان کا مصرعہ:

”حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں“

ایسا بے ساختہ ہے کہ دوسرے مصرعے میں کسی طرح پیروی مغرب کا لفظ لاتے تو آمدوروانی کم ہو جاتی۔

(خیام لاہور ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۶ء)



(۴)

واں بھی ہمیں سچے ہوں تو کیا ہو؟

۸ ستمبر کے خیام میں پروفیسر مسعود حسن صاحب کا مضمون دیکھ کر مجھے اس تصور سے مسرت ہوئی کہ اب امید ہے کہ شبلی صاحب اس بحث و تنقید کو جاری رکھیں گے۔ وہ ستمبر کے بعد بند کرنا چاہتے تھے لیکن حقیقت میں بحث اب رنگ پر آئی ہے۔ اب سے پہلے ارباب نقد و نظر نے جو رائیں لکھی تھیں ان کا یہ رنگ تھا کہ کسی نے ووٹ دینے کے لئے صرف ہاتھ اٹھا دیا، کسی نے ووٹ کا پرچہ ڈال دیا، کسی نے تائید یا تردید میں چند جملے کہہ دیے۔ بحث کی طرح بحث صرف پروفیسر احتشام حسین صاحب، سید اختر علی صاحب تلہری اور عطاء اللہ صاحب پالوی نے کی تھی یا اب مسعود حسن صاحب کا یہ مقالہ نکلا ہے۔ بہت سے بہت ایک دو کو اور بھی شامل سمجھ لیجیے۔

اس مقدمہ کے فیصل ہونے کا جہاں تک تعلق ہے یہ بات امکان سے خارج ہے کہ فریقین کسی فیصلے پر راضی ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ شبلی اور خیام کی عمر قیامت تک دراز کر دے تو نفع صور سے ایک دن پہلے خیام کا جو پرچہ شائع ہوگا اس میں بھی یہی مباحثہ جاری ہوگا اور پھر میدان حشر میں یہ مقدمہ دربارِ واحد قہار میں پیش ہو جائے گا جہاں مولانا حالی بھی موجود ہوں گے۔

مرزا داغ مرحوم اپنے مقدمہ کا تذکرہ کرتے ہیں:

میں نے جو کہا ”سیر ہو کل روز جزا ہو“

فرماتے ہیں ”واں بھی ہمیں سچے ہوں تو کیا ہو“

میں بھی پروفیسر مسعود حسن صاحب اور سید اختر علی صاحب اور ان کے ہم خیالوں سے کہتا ہوں۔ ”واں بھی ہمیں سچے ہوں تو کیا ہو۔“ اور انشاء اللہ ہمیں سچے ہوں گے۔ لکھ رکھیے اس بات کو اور وہ نوشتہ ساتھ لیتے جائیے گا۔ اگرچہ بغیر تحریر کے بھی میں مکر نہ جاؤں گا۔ میں نے کسی کی بحث اور دلیل کا ایک لفظ سنے بغیر حالی کا شعر سنتے ہی معاً اپنی رائے بیان کر دی تھی اور اب تمام مخالف مباحث و دلائل پڑھ کر سمجھ کر اور غور کر کے اپنی اسی رائے کو درست سمجھتا ہوں کہ ”پیروی مغرب“

سے نظم طرز مغرب کی پیروی مراد ہے۔ مولانا محمد شیریں مغربی تیریزی کے نام نامی اور ذات گرامی سے اس شعر کو مولانا حالی کو ان کی شاعری کو ان کے عمل کو ان کے پیغام کو کوئی تعلق نہیں ہے۔

حالی کے اصولِ ثلاثہ

پروفیسر مسعود حسن صاحب نے بڑے سلیقے کا مضمون لکھا ہے بقول میر: ”سلیقہ ہمارا تو مشہور ہے۔“ مولانا حالی کی دو کتابوں سے آٹھ اقتباسات سلسلہ مضامین کے لحاظ سے مرتب کیے ہیں۔ پھر ان کا خلاصہ اپنی مسلسل و مربوط عبارت میں بیان کیا ہے اور پھر تائید میں علامہ شبلی مرحوم کی رائیں بھی نقل کر دی ہیں لیکن اس تمام چھان بین اور کدو کاوش سے اگر کوئی بات ثابت نہیں ہوئی تو وہ حالی کے شعر میں مغربی شاعر کی ضرورت ہے۔ ان کی تمام بحث سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں ایک یہ کہ حالی مغربی شاعر سے واقف تھے اور انھوں نے اپنی تصانیف میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن اس امر سے کسی کو انکار نہ تھا۔

دوسری یہ بات کہ غزل کی اصلاح، ارتقا اور مقبولیت میں تصوف اور صوفی شاعروں کی کار فرمائی شامل حال رہی ہے۔ اس میں بھی کسی کو شک نہ انکار۔ جب غزل کی تاریخ بیان کی جائے گی، غزل کی رفتار دکھائی جائے گی، غزل پر تنقید کی جائے گی تو لاحقہ یہی کہا جائے گا جو پہلے حالی نے اور پھر شبلی نے کہا۔

مولانا حالی نے اپنے مقدمہ دیوان میں اردو غزل پر تبصرہ کیا ہے اور غزل کے مضامین کا تجزیہ کیا ہے۔ اگر صوفیانہ اسلوب بیان کو سراہا ہے تو عاشقانہ طرز ادا کی بھی تعریف کی ہے۔ ان کی پسندیدگی کا معیار تین چیزیں ہیں: ۱۔ صداقت، ۲۔ سادگی، ۳۔ جدت۔ صوفیانہ انداز کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ اس میں بوالہوسی اور نفس پرستی نہیں ہوتی اور حقیقت و مجاز کی جامعیت پیدا ہو جانے سے قبول خاص و عام حاصل ہو جاتا ہے لیکن عاشقانہ خیالات اور طرز بیان کو بھی بہت سراہتے ہیں بشرطیکہ وہ صداقت، سادگی اور جدت رکھتے ہوں۔ تمام مقدمہ دیوان میں مولانا حالی صوفیانہ شاعری یا تصوف کی کارپردازی کا تذکرہ یا تعریف ایک دو جگہ سے زیادہ نہیں کرتے لیکن عاشقانہ مضامین اور ان کے اسالیب بیان اور جدت ادب پر طویل بحث کرتے ہیں۔ مثالیں دیتے ہیں، تبصرہ کرتے ہیں، تعریف کرتے ہیں۔ اصل میں حالی اپنے اصول ثلاثہ کو ہر قسم کی شاعری میں دیکھنا چاہتے ہیں، خواہ حقیقت ہو یا مجاز۔

نظم جدید کی پیروی

اگر پروفیسر مسعود حسن صاحب کے پیش کردہ اقتباسات پر فیصلہ ٹھہرے تو وہ میر و مصحفی جن کی اقتدا سے مولانا حالی اپنے شعر میں اس قدر بیزار معلوم ہوتے ہیں، ان کی اپنے مقدمہ میں اس قدر تعریف کرتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کیا ہوگی۔ یعنی ان کے اکثر کلام کو ”بے مثل و عدیم النظیر“ کہتے ہیں۔ مسعود صاحب کی منتخب کردہ ذیل کی عبارت پڑھیے:

”ہمارے بعض شعراء ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے سادگی بیان کو سب چیزوں سے مقدم سمجھا ہے۔ جیسے میر و درویش، مصحفی وغیرہ..... ان کے کلام میں وہی معمولی خیالات جو متعدد صدیوں سے برابر بندھتے چلے آتے تھے باوجود غایت درجہ کی سادگی اور صفائی کے اکثر جگہ ایسے نرالے اسلوبوں میں بیان ہوئے ہیں جو فی الواقع بے مثل اور عدیم النظیر ہیں۔“

(مقدمہ دیوان)

پھر یہ کیا بات ہوئی کہ یہاں تو یہ کہتے ہیں اور وہاں فرماتے ہیں۔ ”بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے۔“ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں قول اپنی اپنی جگہ صادق ہیں۔ مولانا حالی ”نرالے اسلوبوں“ کے عاشق ہیں، کسی شاعر میں ہوں اور کسی شاعری میں۔ نہ تصوف کی قید نہ عاشقی کی۔ میر و مصحفی کی جدت اسلوب کو پسند کرتے ہیں، اس کی تعریف کر دیتے ہیں۔ ان کے مبتذل اور پامال مضامین کو ناپسند کرتے ہیں، ان کی اقتدا سے بیزاری کا اظہار کر دیتے ہیں۔

اصل میں مولانا حالی اسی جدت اسلوب کے عشق و محبت اور ابتذال کی نفرت کے سبب سے غزل کو چھوڑ کر نظم جدید میں طرز مغرب کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک غزل میں نرالے اسلوب پیدا کرنے اور ابتذال سے بچنے کا امکان باقی نہیں رہا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

”اگر شاعر کے ذہن میں صرف وہی چند محدود خیالات جمع ہیں جن کو اگلے شعر باندھ گئے ہیں تو اس کو ایک مبتذل اور پامال مضمون کے لئے نئے نئے اسلوب بیان ڈھونڈنے پڑیں گے جن کا مقبول ہونا نہایت مشتبہ ہے اور نامقبول ہونا قرین قیاس ہے۔“ (از مقدمہ دیوان چیدہ مسعود حسن صاحب)

میر (یا مصحفی) دوسرے شاعر کا۔ حالانکہ مغربی نہ معروف شاعر تھا۔ نہ اردو داں طبقے کے لئے میر سے افضل ترکیبن انھوں نے محض میر کا قافیہ کھپانے کے لئے یہ شعر کہہ دیا..... اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ اس فارسی شاعر کی تعلیم کیا تھی اور وہ اس قابل تھا بھی یا نہیں کہ اس کی پیروی کی جائے۔ شاعر کا مقصد تو صرف میر کا قافیہ کھپانا تھا۔“

لیکن میرے نزدیک یہ توجیہ درست نہیں۔ یہ رائے اس وقت درست ہوتی جب غزل کی زمین یہ ہوتی: پیروی مغربی کریں۔ دل لگی کریں۔ زندگی کریں۔ اور حالی کا شعر اس طرح ہوتا:

بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے
حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں

اس حالت میں یہ کہا جاسکتا تھا کہ یہاں مغربی کی جگہ رومی، عطار، خسرو، عراقی، سعدی، سنائی، جامی کوئی نہیں آسکتا تھا۔ ”مغربی“ کا نام بے تکلف آتا تھا۔ انھوں نے لکھ دیا۔ اس سے بحث نہیں کہ اس کی تعلیم کیا تھی اور وہ پیروی کے قابل تھا یا نہیں۔ اگرچہ اس صورت میں بھی یہ اعتراض ہو سکتا تھا کہ اگر خانہ پری ہی کرنی تھی تو ”مغربی“ کے ہم وزن اور نام بھی تھے مثلاً رودکی، فرخی، عنصری، عسجدی، انوری۔ لیکن حالی ان میں سے کسی کا نام نہیں لکھ سکتے تھے۔ اس لئے کہ یہ شاعر غزل میں مشہور نہیں ہیں۔ قصیدے کے بادشاہ اور وزیر ہیں اور میر و مصحفی کی شہرت غزل میں ہے اس لئے میری رائے یہ ہے کہ اگر شعری ترتیب برعکس ہوتی اس وقت بھی مولانا صرف بھرتی کے لئے ”مغربی“ کا لفظ نہ لاتے۔ بلکہ اس لفظ کا مفہوم مقصود ہوتا خواہ مغربی شاعر ہوتا یا مغربی شاعری۔

لیکن شعری موجودہ ترتیب میں تو یہ مسئلہ پیش آتا ہی نہیں۔ بلاشبہ غزل کے شعرا لئے کہے جاتے ہیں نیچے سے اوپر کو، بائیں سے دائیں کو، انتہا سے ابتدا کو۔ مولانا حالی نے بھی شمشیر و تیر کی وجہ سے میر کا قافیہ باندھا۔ مگر ”مغربی“ کا لفظ تو پہلے مصرع میں ہے۔ مانا کہ مصحفی و میر کے مقابلے میں کسی اور شاعر کا نام لینا تھا۔ لیکن مغربی شاعر ہی کا نام کیوں لیا۔ جس کا نام چاہتے لکھ سکتے تھے۔ پہلا مصرع تھا۔ قافیہ کی مجبوری نہ تھی۔ اور میر کا قافیہ لانے کے لئے ضرور نہ تھا کہ مقطع ہی لاتے۔ کسی شعر میں باندھ سکتے تھے۔ اگر صوفی شاعر پسند تھے تو رومی، عطار وغیرہ آسکتے تھے۔ دوسری قسم کے شعراء میں عری، نظیری وغیرہ موجود تھے۔ لہذا اس صورت میں بھی میری رائے یہی ہے کہ مولانا حالی نے ”مغربی“ کا لفظ سمجھ کر رکھا ہے چاہے مغربی شاعر مراد ہو یا مغربی شاعری۔

صوفیانہ مضامین کا استثنا

”چند محدود خیالات“ میں صوفیانہ و عاشقانہ دونوں خیالات شامل ہیں۔ تصوف کے مضامین بھی لامحدود نہیں ہیں اور ان میں بھی اگلے شعرا نے باندھنے سے کچھ نہیں چھوڑا۔ تصوف کے مبتذل اور پامال مضمون کے لئے بھی نئے نئے اسلوب بیان ڈھونڈنے پڑیں گے جن کا مقبول ہونا نہایت مشتبہ ہے اور ناقابل مقبول ہونا قرین قیاس ہے۔ صوفیانہ مضامین کے استثنا کا کوئی سبب ہو تو مجھے بتائیے۔ پھر مولانا حالی اختیار تصوف (پیروی مغربی) کی وصیت کیوں کرتے اور اس سے شاعری میں کیا اصلاح کر سکتے تھے؟ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ غزل میں جس قسم کے مضامین لکھے جاتے رہے ہیں ان میں اب جان نہیں رہی۔ ان سے اب شاعری کو، ملک و قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے غزل ہی کو سرے سے ترک کر دینا چاہیے اور نئی قسم کی بیانی، تمثیلی، مجاہداتی نظمیں لکھنی چاہئیں جیسی انگریزی میں اور مغرب کی دوسری زبانوں میں لکھی جاتی ہیں۔ ان میں خیالات و اسالیب بیان کی کثرت و جدت کی کوئی حد نہیں۔ ایک سے ایک نرالا اسلوب پیدا ہو سکتا ہے۔ شعر و ادب کی اصلاح اور ملک و قوم کا فائدہ ظاہر ہی ہے۔

اس بات پر غور فرمائیے کہ حالی اپنے شعر میں ایک پیغام دیتے ہیں۔ خود اس پر اپنی باقی زندگی میں عمل کرتے ہیں اور اسی کی دوسروں کو تلقین و ہدایت کرتے ہیں۔ اب بتائیے کہ مغربی شاعر کی پیروی اور صوفیانہ غزلیں لکھنے کا کیا محل رہا۔ مغربی تہریزی کے متعلق علامہ شبلی مرحوم کی یہ رائے نجیام میں درج ہو چکی ہے کہ مغربی نے ایک لفظ وحدت الوجود کے علاوہ نہیں لکھا اور اس مضمون و انداز بیان کی تکرار اس قدر زیادہ ہے کہ کلام بے مزہ ہو جاتا ہے۔ مولانا حالی جو جدت اسلوب کو پسند کرتے ہیں۔ تکرار مبتذل کو کیوں نہیں پسند کر سکتے تھے؟

نظیر لودیانوی کی توجیہ

۲۳ رتبہ کے خیرام میں خان اصغر حسین خاں صاحب نظیر لودیانوی (لدھیانوی) نے ”پیروی مغربی“ کے متعلق ایک نئی توجیہ پیش کی ہے۔ لکھتے ہیں:

”حقیقت یہ ہے کہ حالی نے اس غزل میں محض میر کا قافیہ باندھنے کے لئے یہ شعر کہا تھا اور پہلے مصرع میں اصول بلاغت کے مطابق ایک شاعر (مغربی) کا نام لائے، اور دوسرے میں

خان اصغر حسین خاں صاحب نے جو ناسخ کے اس شعر کی مثال دی ہے:

ہے نہال فکر ناسخ کی جو شادابی یہی

لکھنؤ میں آئے گی روح غنی کشمیر سے

تو یہ مثال یہاں صادق نہیں آتی۔ ناسخ کی غزل کا قافیہ ”کشمیر“ ہے ان کو کشمیر سے کچھ نہ کچھ لانا تھا۔ پھل اور پتوں نہ سہی، روح غنی ہی سہی۔ اور یہی ٹھیک بھی تھا۔ غزل کا مضمون بھی ہو گیا، اپنی تعلقی بھی ہو گئی، لکھنؤ اور کشمیر کا مقابلہ بھی ہو گیا اور نہال فکر کی شادابی سے شعر کا گلدستہ بھی بن گیا حالی کو میر کا قافیہ کھپانا تھا۔ اس لئے انھوں نے غزل گوئی کی الٹی چال کے قاعدے سے پہلے دوسرا مصرع کہا۔ ”بس اقتدائے مصطفیٰ و میر کر چکے“۔ اور پھر سوچا کہ اب کس کی پیروی کریں؟۔ اور وہ اس شعر کو مقطع کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے پہلے مصرع میں حالی تخلص بھی لانا تھا۔ تو گو یا یہ الفاظ ان کے ذہن میں تھے۔ ”حالی اب آؤ پیروی..... کریں۔“ ایک لفظ لانا تھا خان اصغر حسین خاں صاحب کی رائے ہے کہ مولانا کے ذہن میں یکا یک مغربی شاعر کا نام آ گیا اور انھوں نے جلدی سے مصرع پورا کر کے۔ ”حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں“ اطمینان کا سانس لیا کہ چلو مقطع بھی ہو گیا اور غزل مکمل ہو گئی، ”اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ اس فارسی شاعر کی تعلیم کیا تھی اور وہ اس قابل تھا بھی یا نہیں کہ اس کی پیروی کی جائے۔ مقصد تو صرف میر کا قافیہ کھپانا تھا۔“ وہ مغربی کے مقابلے سے بھی کھپ گیا۔ لیکن بعض حضرات خاں صاحب کی رائے سے اتفاق نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ حالی نے ”مغربی“ کے لفظ سے صرف خانہ پُر نہیں کی، بلکہ مغربی تہریزی کی صوفیانہ شاعری، اس کے مسلک وحدت الوجود اور اس کے کلام میں اس وحدت کی کثرت کو پسند کر کے، خود اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی نیت سے اور دوسروں کو اس کا مرید بنانے کے ارادے سے اس کا نام لیا ہے اور میں یہ کہتا ہوں کہ حالی ”پیروی مغرب“ لکھنا چاہتے تھے مگر مصرع میں جو جگہ خالی تھی ”مغرب“ کا لفظ اس کو نہیں بھر سکتا تھا۔ اس لئے انھوں نے ”مغرب“ کی جگہ ”مغربی“ کا لفظ رکھ دیا۔ اور معنی وہی لئے جو ”پیروی مغرب“ کے لیتے۔

فیصلے کی ایک راہ

بہر حال یہ بحثا بحثی یوں ہی چلتی نظر آتی ہے اور کچھ نتیجہ نکلتا معلوم نہیں ہوتا۔ یہ دیکھ کر فیصلے کی

ایک راہ مجھے نظر آئی، اگر اس میں روڑے اور کانٹے نہ نکل آئیں یعنی اس امر کی تحقیق کرنی چاہیے کہ مولانا حالی نے یہ غزل کس زمانے میں لکھی ہے۔ میں اور دوسرے حضرات جو ”مغربی شاعری“ مراد لے رہے ہیں وہ محض اس مفروضے کی بنا پر کہ مولانا نے یہ غزل اس وقت کہی ہے جب وہ انگریزی شاعری اور انگریزی لٹریچر سے آشنا ہوتے جاتے تھے اور اس کو پسند کرنے لگے تھے لیکن مولانا حالی کی عمر کے پہلے تیس سال ایسے ماحول میں گزرے ہیں جہاں انگریزی زبان و ادب کا کوئی ذکر و فکر نہ تھا۔ ان کی نوجوانی اور تعلیم کا زمانہ وہاں گزرا جہاں بقول ان کے، انگریزی کے مدرسہ کو جملہ (جہالت گاہ) کہا جاتا تھا۔ سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں دہلی گئے۔ اس وقت دہلی کا لُج خوب رونق پر تھا مگر انھوں نے کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں۔“ (یہ مولانا حالی ہی کے الفاظ ہیں) اسی زمانے میں مرزا غالب سے اکثر ملتے رہے۔ ایک دو غزلیں بھی دکھائیں۔ یہ ۱۸۵۵ء کا ذکر ہے۔ پھر غدر کے بعد ۱۸۶۳ء سے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی مصاحبت میں کئی سال رہے۔ ان کے ساتھ فارسی اور اردو میں غزلیں کہتے اور اصلاح کے لئے مرزا غالب کو بھیجتے رہے۔ اس وقت تک مولانا حالی کو انگریزی شعر و ادب سے مناسبت پیدا کرنے کا موقع نہیں ملا۔ نواب شیفتہ کی وفات کے بعد غالباً ۱۸۷۰ء سے ان کو پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازمت ملی اور وہ چار سال لاہور میں قیام کر کے انگریزی سے اردو ترجموں کی عبارت درست کرتے رہے۔ یہاں انگریزی ادب و شعر سے بذریعہ تراجم واقف ہوئے، جیسا کہ خود فرماتے ہیں کہ ”اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔“

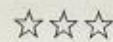
اب اگر حالی نے وہ غزل غالب و شیفتہ کی صحبت میں رہ کر لکھی ہے تو شبلی و خلیفہ کی صحافت آرائی اور میری خامہ فرسائی اور دوسروں کی تیسرہ پیرائی سب کا فیصلہ ہوا رکھا ہے کہ مغربی سے مراد خواہ وہ شبلی صاحب کا مغربی تہریزی ہو یا مولوی سعید احمد صاحب اکبر آبادی مدبر بان دہلی کا مغربی اندلسی (ابن زیدون) ہو یا کوئی مغربی کالا چور ہو، مگر شاعری ہرگز مراد نہیں ہو سکتی۔ اگر حالی اس مقطع کے لکھنے کے وقت مغربی شاعری سے واقف ہی نہ تھے تو اسے کیونکر مراد لے سکتے تھے۔ اور جب شاعری مراد لینا ٹھہرے تو بلاشبہ مغربی تہریزی ہی ہونے چاہئیں۔ اس لئے کہ اوّل تو کوئی دوسرا مغربی تخلص کا شاعر ہی نہیں ہے۔ دوسرے ہم نے فرض کیا ہے کہ یہ غزل نواب شیفتہ کی صحبت میں لکھی گئی ہے۔ نواب شیفتہ صوفی منش بزرگ تھے۔ ان کے کلام میں تصوف بہت ہے مجھے معلوم تو نہیں مگر ممکن ہے ان کے ہاں قوالی بھی ہوتی ہو اور اس میں مغربی تہریزی کی غزلیں گائی

جاتی ہوں۔ اور ہو سکتا ہے کہ کسی روز قوالی میں مغربی کی صوفیانہ اور والہانہ غزلیں سننے کے بعد مولانا حالی نے اپنی غزل لکھی ہو اور مقطع کہتے وقت مغربی کے کلام کی لذت دل و دماغ میں موجود ہو۔

غزل کس زمانے کی ہے؟

لیجیے میں نے مغربی تبریزی کی تائید میں شبلی صاحب اور سیما صاحب اور مسعود حسن صاحب وغیرہ وغیرہ سب کی طرف سے کتنی قوی دلیلیں پیش کر دیں۔ اب تحقیقات کا کام میرے بدلے یہ حضرات کر دیں۔ یہ بات ثابت ہونی چاہیے کہ مولانا حالی نے یہ غزل اسی زمانہ میں پانی پت یا دہلی یا جہانگیر آباد میں کہی ہے۔ جب وہ انگریزی ادبیات و شاعری سے آشنا تھے۔ میرے پاس اس وقت نہ حالی کا دیوان ہے نہ شیفتہ کا مگر ایک ذریعہ اپنے قیاس سے عرض کرتا ہوں دیوان حالی میں غالباً قدیم وجدید کلام میں امتیاز پیدا کیا گیا ہے اور قدیم غزلوں پر 'ق' لکھ دیا ہے۔ ممکن ہے ان غزلوں میں یہ بھی ہو۔ دوسرے یہ کہ مولانا حالی نے خود نوشت حالات میں لکھا ہے کہ "اسی زمانے میں اردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انھیں کے ساتھ میں بھی اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا تو ممکن ہے نواب شیفتہ نے بھی "تدبیر کر چکے، تقدیر کر چکے" کی زمین میں غزل کہی ہو اور ان کے دیوان میں موجود ہو۔ اگر ایسا ہے تو بس فیصلہ سمجھیے۔ حالی اور شیفتہ دونوں نے ساتھ غزلیں لکھی ہوں گی اور ان پر غالب کی اصلاح ہوئی ہوگی۔ غالب کے زمانے میں قوی قرینہ اسی بات میں ہے کہ حالی مغربی نظموں کے گردیدہ نہ ہوئے ہوں گے۔

لیکن اگر یہ مقطع اس وقت لکھا ہے جب مولانا حالی انگریزی ادب اور انگریزی کی نظموں کو پسند کرنے لگے تھے تو پھر "پیروی مغربی" سے "پیروی مغرب" مراد ہونا یقینی ہے۔ بعد کے زمانہ میں "مقدمہ دیوان" اور "مدرس" اور جدید نظموں کی تصنیف کے دوران میں مولانا حالی کو مغربی تبریزی کا تصور آنے کا بھی امکان نہیں ہے۔ (خیام لاہور ۸ نومبر ۱۹۶۶ء)



۱۔ محمد بن عبدالدین بن عادل بن یوسف تبریزی۔ شیریں تبریزی کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آٹھویں صدی ہجری کے ایرانی صوفی شعراء میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۸۰۹ھ میں وفات پائی۔ انہیں مغربی اس لیے کہا جاتا ہے انہوں نے شمال مغربی افریقہ کی سیر کی جہاں ان کی ملاقات شیخ محی الدین عربی کے ایک مرید سے ہوئی جس نے انہیں "خرقہ" بھی عطا کیا۔ "مجمع الفصیح" کے مصنف رضا قلی خان کے مطابق وہ اصفہان کے قریب ایک گاؤں ناعین میں پیدا ہوئے اور فارس کے ایک گاؤں میں دفن ہوئے لیکن انہیں عام طور پر تبریزی کا باشندہ قرار دیا جاتا ہے۔

ان کی تمام تر شاعری تصوف کے رنگ میں رنگی ہے۔ ان کی شاعری کا بنیادی نکتہ "وحدت الوجود" ہے۔ تاریخ ادبیات ایران کے مؤلف براؤن کے مطابق مغربی تبریزی کا دیوان ۱۵۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ میں ۱۷ اسطریں ہیں اشعار کی کل تعداد ۲۳۰۰ کے قریب ہے۔ ان کا نمونہ کلام:-

از دیدہ عشق بروں کرد نگاہے

تا حسن خود از روئے بتاں کرد تماشا

اے مغربی آفاق پر از دلولہ گردد

سلطان جہالم چو زند خیمہ بھرا

۲۔ سورۃ الشعراء آیت نمبر ۲۲۶

۳۔ سورۃ الشعراء آیت نمبر ۲۲۵

۴۔ ابوالولید احمد بن غالب بن زیدون قرطبی عربی کے معروف مرثیہ گو شاعر تھے۔ ۳۹۴ھ میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں یتیم ہو گئے۔ جوانی میں ایک خاتون کے عشق میں گرفتار ہوئے۔ اپنے رقیب کو مارنے کے جرم میں گرفتار کر لیے گئے۔ طویل قید کے بعد رہا ہوئے تو معتضد باللہ کے دربار میں اشبیلیہ آ گئے اور بڑے مقام و رتبہ سے سرفراز ہوئے۔ معتضد کے بعد اس کے فرزند نے قلم دان وزارت سونپا۔ ۴۶۳ھ میں بخارا میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔ اندلس کی نسبت سے انھیں مغربی بھی کہا جاتا ہے۔



عالمگیری نسخہ قرآن مجید اور اس کے اغلاط کتابت

(۱)

شہنشاہ غازی اورنگ زیب عالمگیر کا قلمی قرآن مجید خواجہ حسن نظامی صاحب نے بلاک بنا کر چھپوایا تھا۔ شاید آپ نے دیکھا ہو۔ حال میں معلوم ہوا ہے کہ اس کے کئی ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں۔ اور بڑی بڑی قیمت کو ہدیہ کیے گئے ہیں لیکن اب دہلی میں اس کا ایک ارزاں ایڈیشن تیار ہوا ہے اور اس کا ہدیہ صرف بارہ آنے ہے۔ ایسے نادر تحفے کا یہ ہدیہ مفت برابر ہے۔ لیکن اس نسخہ عالمگیری کے جتنے ایڈیشن نکلے ان میں بھی اور ان کے اشتہارات میں بھی اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا کہ اس نسخہ میں کتابت و طباعت کی غلطیاں اس کثرت سے ہیں کہ یہ نسخہ غیر حفاظ و غیر علماء کی تلاوت کے کام کا نہیں ہے۔ بہت سی غلطیاں ایسی ہیں کہ معمولی ناظرہ خواں کو محسوس بھی نہیں ہو سکتیں اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ اس کی خریداروں میں وہ لوگ بھی ہوں گے جو حافظہ و عالم نہیں ہیں۔ وہ بھی ہوں گے جو اس نسخہ کو صرف یادگار کے طور پر رکھنے کیلئے نہیں بلکہ تلاوت کے لئے حاصل کریں گے وہ لوگ بھی ہوں گے جن کے پاس تلاوت کے لیے یہی ایک نسخہ ہوگا۔ ایسے اشخاص قرآن مجید کو غلط پڑھ لیں گے اور ان کو خبر بھی نہ ہوگی اس کا عذاب کس کی گردن پر ہوگا؟ قرآن شریف میں ایک نقطہ ایک زیر زیر ایک حرف ایک لفظ کی غلطی بھی بہت ہوتی ہے اور اس نسخہ میں تو ہر قسم کی چھوٹی بڑی غلطیاں شمار و حساب سے بڑھ کر ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ اس نسخہ عالمگیری کا اشتہار جہاں جہاں شائع ہوتا ہے اور جو لوگ اس کو فروخت کرتے ہیں مثلاً جامعہ ملیہ دہلی، رسالہ پیشوا دہلی، رسالہ مولوی دہلی، مکتبہ جہاں نمادہلی، یہ سب مشتہرین اشتہار میں اس کا ذکر کر دیں کہ نسخہ کو تلاوت کیلئے نہ لیا جائے۔ صرف یادگار رکھنے کے لیے اور شاہی تبرک سمجھ کر خریدا جائے۔ ایک مسلمان شہنشاہ کی تاریخی یادگار حاصل کرنے کیلئے بارہ آنہ صرف کرنا کیا بڑی بات ہے۔ امید ہے کہ باوجود اس اعلان و اطلاع کے لوگ اس نسخہ کو ضرور خریدیں گے۔ اور فرض کیجیے ایک شخص بھی غلط ہونے کے سبب ہی نہ خریدے پھر بھی مشتہرین کا فرض ہے کہ پبلک کو دھوکہ نہ دیں۔

میرے پاس اس نسخہ عالمگیری کی ایک جلد موجود ہے۔ میں نے پڑھ کر دیکھا ہے۔ بے شمار غلطیاں پائی ہیں۔ بطور نمونہ چند اغلاط درج کرتا ہوں آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

نسخہ عالمگیری کا حوالہ	نسخہ عالمگیری کی غلطی	صحیح نسخہ	صراحت غلطی
(۱) صفحہ ۱۱ (سورہ بقرہ)	لَعَلَّكُمْ تَحْذَرُونَ	لَعَلَّكُمْ تَحْذَرُونَ ۱	وال کی جگہ ذال لکھ دی ہے۔
(۲) صفحہ ۲۷ (سورہ بقرہ)	تَتَجَمَّعُونَ لَهَا	تَتَجَمَّعُونَ لَهَا ۲	تشدید نہیں لکھا۔
(۳) صفحہ ۳۱۰ (سورہ ہود)	أَلَمْ يَأْتِ الْيَهُودَ	أَلَمْ يَأْتِ الْيَهُودَ ۳	لفظ کچھ کا کچھ لکھ دیا۔
(۴) صفحہ ۳۲۲ (سورہ ہود)	مَنْ يَأْتِ عَذَابَ الْخُزْنِ	مَنْ يَأْتِ عَذَابَ ۴	ب پر تنوین نہیں لکھی صرف پیش لکھا ہے اور وہ غلط ہے۔
(۵) صفحہ ۳۲۴ (سورہ ہود)	كَانَ لَمْ يَخْلُ	كَانَ لَمْ يَخْلُ ۵	بخو میں ی کی جگہ ب لکھ دی ہے۔
(۶) صفحہ ۳۲۴ (سورہ ہود)	وَيَسْأَلُونَكَ	وَيَسْأَلُونَكَ ۶	المورد و الف وصل نہیں لکھا۔
(۷) صفحہ ۳۳۱ (سورہ یوسف)	مَعَاذَ اللَّهِ	مَعَاذَ اللَّهِ ۷	ع کی جگہ غ لکھ دی ہے۔
(۸) صفحہ ۳۵۱ (سورہ رد)	وَيَسْأَلُونَكَ	وَيَسْأَلُونَكَ ۸	خ کی جگہ د لکھ دی ہے۔
(۹) صفحہ ۳۵۱ (سورہ رد)	بُخْشَ عَذَابٍ	بُخْشَ عَذَابٍ ۹	الف زائد لکھ دیا ہے۔
(۱۰) صفحہ ۳۵۸ (سورہ ابراہیم)	وَمَا كَانَ لَنَا	وَمَا كَانَ لَنَا ۱۰	ن کی جگہ ت لکھنے سے صیغہ بجائے متکلم کے غلط ہو گیا ہے۔
(۱۱) صفحہ ۲۲ (سورہ بقرہ)	مَنْ كَانَ عَذَابَ اللَّهِ	مَنْ كَانَ عَذَابَ اللَّهِ ۱۱	اس طرح لکھ دیا ہے جیسے عام طور پر بولتے ہیں جبرئیل و میکائیل مع ہمزہ کے لکھا ہے حالانکہ دونوں جگہ قرآن میں ہمزہ نہیں ہے۔
(۱۲) صفحہ ۶۲۶ (سورہ یٰسین)	إِنْ يَرَوْا	إِنْ يَرَوْا ۱۲	ت کی جگہ ن لکھنے سے صیغہ بدل گیا۔
(۱۳) صفحہ ۶۲۸ (سورہ یٰسین)	وَيَسْأَلُونَكَ	وَيَسْأَلُونَكَ ۱۳	ر کی جگہ "و" لکھ دیا ہے جس سے لفظ بدل گیا اور مہمل ہو گیا۔
(۱۴) صفحہ ۸۳۲ (سورہ مدثر)	وَيَسْأَلُونَكَ	وَيَسْأَلُونَكَ ۱۴	د حرف (اد) لکھنے سے مد گئے۔

میں نے پورے نسخہ عالمگیری کی تلاوت نہیں کی ہے صرف بعض صفحات پڑھے ہیں ان کی اغلاط تیس ہیں۔ جن کی فہرست میں نے بنائی ہے اس فہرست میں سے بطور نمونہ ۱۴ غلطیاں آپ کو لکھی ہیں۔ اس سے آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ پورے قرآن مجید کے ۸۷۲ صفحات میں کس قدر غلطیاں ہونی ممکن ہیں۔ آپ اس مضمون اور ان اغلاط کو درج اخبار کر کے خواجہ صاحب اور مشہرین قرآن سے درخواست کیجیے کہ اس دینی و قرآنی معاملہ میں نفع کا لالچ نہ کریں اور شرح صدر کے ساتھ نسخہ کے غلط ہونے کا اعلان کر دیں۔ بلکہ ہر نسخہ پر اس اطلاع کی چٹ چھاپ کر چسپاں کر دیں۔ میں آپ سے یہ بھی عرض کر دوں کہ خواجہ صاحب نے اس نسخہ کے دیباچہ میں یہ اعلان کیا ہے کہ اس میں کہیں کہیں صرف رسم الخط کا اختلاف ہے اور کسی قسم کی غلطی نہیں حالانکہ آپ نے دیکھا کہ رسم خط کی غلطی نہیں ہے بلکہ اور ہر قسم کی غلطیاں ہیں۔ والسلام مع الاکرام۔

(اخبار دہلیہ سکندریہ رامپور ۲۳ جنوری ۱۹۳۹ء)

☆☆

(۲)

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر غازیؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قلمی قرآن مجید نواب صاحب مانگروں (کٹھیا واڑ) کے کتب خانہ میں تھا۔ خواجہ حسن نظامی صاحب کو اس کا علم ہوا۔ انھوں نے بڑی کوشش سے وہ مستعار لیا اور صرف کثیر سے اس کا بلاک بنوا کر چھپوا دیا۔ یہ اپنی قسم کی پہلی خدمت اسلام تھی اور حقیقت میں عجیب نادر تحفہ تھا۔ مسلمانوں نے ویسی ہی اس کی قدر کی اور بقول خواجہ صاحب کے پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا لیکن اسی زمانہ میں بعض لوگوں نے اس کو پڑھ کر دیکھا اور اغلاط کتابت کی اتنی کثرت پائی کہ بغیر اعلان اغلاط اس کی اشاعت کو نا مناسب سمجھا اور اخباروں میں مضمون لکھے لیکن خواجہ صاحب کی طرف سے اخبارات میں اس کا جواب شائع ہوا کہ لوگ حسد کے سبب سے ایسا کہتے ہیں۔ میں نے بھی اس زمانے میں یہ شور سنا تھا۔ لیکن اس وقت میرے پاس اس کا کوئی نسخہ نہ تھا۔

اس وقت میرے سامنے اس نسخہ عالمگیری کا دوسرا ایڈیشن ہے اور میں نے مختلف مقامات سے اس کو مسلسل پڑھا ہے۔ فی الواقع ہر قسم کی چھوٹی بڑی غلطیاں نہایت کثرت سے ہیں لیکن اسی ایڈیشن کے دیباچہ میں خواجہ صاحب کا یہ جواب عرض بھی موجود ہے۔ بعینہ نقل کرتا ہوں فرماتے ہیں:

”یہ چیز تجارتی مقصد سے شائع نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک مسلمان شہنشاہ کی تاریخی یادگار کو ہر گھر تک پہنچانا تھا مگر افسوس ہے کہ بعض حاسد لوگوں نے تجارتی رقابت کے خیال سے اس کی مخالفت کی اور طرح طرح کے بے سرو پا مضامین اخبارات میں شائع کرائے۔ مگر جب ان حاسد لوگوں سے ان الزامات کی بابت جواب طلب کیا گیا تو ایک شخص کو بھی جواب دینے کی جرأت نہ ہوئی۔ مسلمان پبلک شہر گیا اور بخیر اور دینی کے محض تین معترض اشخاص کی نیت کو سمجھ گئی تھی۔ اس لیے ان تینوں کی حاسدانہ تحریروں کا مسلمانوں پر کچھ اثر نہ ہوا اور قرآن مجید کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ لے لیا گیا کیونکہ مسلمان جانتے تھے کہ

غازی اور نگ زیب کے زمانے میں جو رسم خط تھا اس میں اور آج کل کے رسم خط میں قدرے فرق ہو گیا ہے اور جب قرآن شریف نازل ہوا تھا اور خط کوئی میں لکھا گیا تھا اگر اس قدیمی رسم خط کو آج کل کے خط کے مطابق کرنے کی کوشش کی جائے تو مطابقت قطعاً محال ہو جائے گی کیونکہ پہلے رسم خط میں نہ اعراب تھے نہ نقطے تھے نہ مد تھے نہ تشدید تھی نہ جزم تھے نہ حروف کی آجکل کی سی کشش تھی پس حاسدوں کا رسم خط کے فرق پر اعتراض کرنا ایسا ہی بے نتیجہ اور مہمل تھا جیسا کوئی اس پر اعتراض کرے گا کہ قرآن مجید پر اعراب کیوں ہیں نقطے کیوں ہیں جزم کیوں ہے مد کیوں ہیں تشدید کیوں ہیں یہ تو ابتدائی زمانے میں نہ تھے۔“

میں اس بیان کو پڑھ کر حیران ہوں کہ کیا سمجھوں اور کیا کہوں اس نسخہ میں غلطیوں کا حدِ شمار سے بڑھ کر ہونا میری نظر میں ہے اور خواجہ صاحب کی یہ تحریر نظر کے سامنے۔ خواجہ صاحب کی نیت بخیر ہونے میں شک نہیں۔ ان کو تجارت مقصود ہونے سے انکار کرنے کی میرے پاس کوئی وجہ نہیں۔ مسلمان شہنشاہ کی تاریخی یادگار کو ہر گھرنیک پہنچانے کا شوق بالکل بجا اور مسلم ہے لیکن تعجب ہے کہ یہ لکھے دار تحریر اور پیچدار جواب ان کے قلم سے کیوں نکلا۔ مجھے اس وقت یاد نہیں کہ ان کے تجارتی رقابت رکھنے والے حاسد لوگ کون تھے اور انہوں نے کیا کیا اعتراضات کئے تھے اور خواجہ صاحب کی جواب طلبی پر ایک شخص کو بھی جواب دینے کی جرأت ہوئی تھی یا نہیں لیکن خواجہ صاحب سے سوال یہ ہے کہ انہوں نے ابتدائے سہی اعتراضوں کی تصدیق و تکذیب ہی کے لیے اس نسخہ کے دس پانچ صفحے پڑھ کر بھی دیکھے تھے یا نہیں۔ میرا احسن ظن یہ ہے کہ انھوں نے پڑھ کر نہ دیکھا ہوگا لیکن کہیں اختلاف کتابت پر نظر پڑ گئی ہوگی یا کسی نے کہہ دیا ہوگا کہ اختلاف قرأت یا اختلاف رسم خط کے علاوہ کوئی غلطی نہیں ہے۔ وہی خواجہ صاحب نے لکھ دیا۔ لیکن اگر یہ بات ہے تو یہ جواب لکھنا نہایت غلاف احتیاط اور قاریوں کی غلط خوانی کا گناہ اپنے سر لینا تھا۔ خواجہ صاحب کو دیکھنا چاہیے تھا کہ اس نسخہ میں:

۱۔ اختلاف قرأت ہے

۲۔ اختلاف رسم خط ہے

۳۔ نقطے پھوٹ گئے ہیں

۴۔ ایک نقطہ کی جگہ دو نقطے لگا دیے گئے ہیں۔

۵۔ دو نقطوں کی جگہ ایک نقطہ دے دیا گیا ہے۔

۶۔ حرف کچھ کا کچھ لکھ دیا گیا ہے۔

۷۔ الف وصل لکھنے سے رہ گیا ہے۔

۸۔ بے ضرورت الف لکھ دیا گیا ہے۔

۹۔ حرف کا حرف چھوٹ گیا ہے۔

۱۰۔ لفظ غلط لکھ دیا گیا ہے۔

۱۱۔ تحریر ایسی مسخ ہو گئی ہے کہ آیت کے الفاظ کچھ کے کچھ پڑھ جاتے ہیں۔

اور اس کے ساتھ خواجہ صاحب کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہئے تھا کہ اس نسخہ کے خریداروں میں وہ لوگ بھی ہوں گے جو حافظ نہیں ہیں۔ سودہ لوگ بھی ہوں گے جو عربی کے عالم نہیں ہیں وہ لوگ بھی ہوں گے جو صرف یادگار عالمگیری سمجھ کر نہیں بلکہ تلاوت کے لیے خریدیں گے۔ وہ لوگ بھی ہوں گے جن کے پاس تلاوت کے لیے ایک یہی نسخہ ہوگا۔

میں نے اغلاط کی جو اقسام اوپر درج کی ہیں۔ یہ مجھے تھوڑے سے حصے میں ملی ہیں۔ جتنا میں نے پڑھ کر دیکھا ہے۔ تمام قرآن مجید کی تلاوت نہ کر سکا۔

اختلاف رسم خط کی تو یہ صورت ہوتی ہے کہ مثلاً سورۃ یٰسین میں ہے۔ اِنْسِیْ اَمْسِنْتُ بِرَبِّکُمْ فَاسْمَعُوْنَ ۝ یہ طرزِ تحریر ہندوستان کے تمام جدید مطبوعہ نسخہ میں ہے۔ بالکل یہی صورت حضرت عالمگیری نے اختیار کی ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ (اِنْسِیْ) کے کون کا زیر اس طرح لگایا ہے یعنی کھڑا زیر باقی اعراب ومد وغیرہ یکساں ہیں۔ لیکن قرآن مجید مطبوعہ مصر میں اس طرح لکھا ہوا ہے۔ اِنْسِیْ ؕ اَمْسِنْتُ یعنی پہلے الف کے نیچے ہمزہ لکھ کر اس کے نیچے زیر ہے۔ مد بجائے نون کے اوپر لکھنے کے ی کے اوپر لکھا ہے۔ دوسرے الف پر کھڑا زیر یا الف مدودہ لکھنے کی جگہ الف سے پہلے ہمزہ لکھ کر مدودہ کا اظہار کیا ہے۔

دوسری مثال یہ ہے کہ جہاں الف مقصورہ ہوتا ہے وہاں صرف کھڑا زیر لگایا کرتے ہیں جیسے مَلِکٌ۔ غُفْلَہَا خُلِیدِیْنِ۔ وغیرہ ہندوستان میں یہی رسم خط ہے اور نسخہ عالمگیری میں یہی ہے۔ لیکن مصری رسم خط میں معمولی زیر بھی لگاتے ہیں اور کھڑا زیر بھی۔ دونوں ایک ہی حرف پر ہوتے ہیں۔ مثلاً مَلِکٌ۔ غُفْلَہَا۔ خُلِیدِیْنِ۔ یہ اختلاف بقول خواجہ صاحب کے قدرے ہے۔ ورنہ

ہر جگہ آج کل کے رسم خط کے مطابق ہے۔ اس نسخہ میں جو غلطیاں قابل اعتراض ہیں وہ رسم خط و قرأت کی نہیں ہیں بلکہ اس سے سخت غلطیاں ہیں۔ جن کی ایک ایک دو دو مثالیں درج کرتا ہوں:-

(۱) نسخہ عالمگیری صفحہ ۵ سورہ بقرہ۔ وَمَا كَاوَا مُهْتَدِينَ^{۱۵} لکھا ہوا ہے یعنی کانوا کا نون ہلاک میں آنے اور چھپنے سے رہ گیا۔ اس کا نقطہ اور پیش موجود ہے۔

(۲) صفحہ ۷ (سورہ بقرہ) وَيُنْفِثُ دُورْفٰی الْاَرْضِ^{۱۶} لکھا ہوا ہے۔ یعنی نون پورا نہیں بنا۔ اس کا نقطہ بھی نہیں ہے۔ جس سے نون پڑھ لیا جاتا۔ ”ز“ کی صورت بنی ہوئی ہے اور (رے) پڑھی جاسکتی ہے۔

(۳) صفحہ ۸ (سورہ بقرہ) اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ^{۱۷} لکھا ہوا ہے یعنی اِنِّیْ کے نون کا شوشہ نہ نقطہ۔

(۴) صفحہ ۱۱ (سورہ بقرہ) اِذَا وَاَعْدَا^{۱۸} لکھا ہوا ہے یعنی نون کا نقطہ نہیں ہے۔

(۵) صفحہ ۱۱ (سورہ بقرہ) لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ لکھا ہوا ہے۔ یعنی دال کی ذال ہو گئی ہے۔

(۶) صفحہ ۲۵ (سورہ بقرہ) اِنْ يَذَّكَّرْ فِيْهَا اسْمًا وَّ سَعٰی فِیْ خَرَابِہَا لکھا ہوا ہے۔ یعنی ’اسما‘ میں ’ہ‘ نہیں بنی۔

(۷) صفحہ ۲۷ (سورہ بقرہ) اَنْعَمْتَ اَلَّتِیْ اَنْعَمْتَ لکھا ہوا ہے یعنی (اَلَّتِیْ) کا تشدید نہیں ہے۔ حالانکہ اور تشدید کے موقع پر تشدید موجود ہے۔

(۸) صفحہ ۲۷ (سورہ بقرہ) لَا يَنْالُ غٰهْدِیَ الظَّلَمِیْنَ^{۱۹} لکھا ہوا ہے یعنی ’ی‘ پر زبر لکھا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ زبر رسم خط کے خلاف ہے۔ اگر اختلاف قرأت ہے تو کسی مصرعہ بند کے نسخہ میں ایسا نہیں ہے۔

(۹) صفحہ ۳۰ (سورہ بقرہ) وَلَکَ اَعْمَا لَکُمْ^{۲۰} لکھا ہوا ہے۔ یعنی ’لکم‘ کا میم نہیں بنا۔ اس کا جزم موجود ہے۔ قلمی نسخہ میں مٹ گیا ہوگا۔ ہلاک میں نہیں آیا۔

(۱۰) صفحہ ۳۰ (سورہ یونس) اَعْبَدُ اللّٰہَ الَّذِیْ یَتَوَفَّکُمْ^{۲۱} لکھا ہوا ہے یعنی ’ف‘ پر تشدید نہیں ہے اور کھڑے زبر کی جگہ پر زبر ہے۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں اور مقامات موجود ہیں۔

(۱۱) صفحہ ۳۱ (سورہ ہود) اَلْسِیْ یَوْمَ یَاْتِیْہِم لکھا ہوا ہے یعنی (آلا) کی جگہ ’اَلْسِی‘ لکھا ہے۔ یہ کوئی رسم خط کبھی کا اور کہیں کا نہیں ہے۔

(۱۲) صفحہ ۳۲ (سورہ ہود) مَنْ یَّاْتِیْہِ غَدَاْبٌ یُّخْرِیْہِ لکھا ہوا ہے۔ یعنی ’ب‘ پر تنوین

نہیں ہے۔ ایک پیش ہے اور یہ از روئے قواعد نحو یہ غلط ہے اور اس کا رسم خط سے کوئی تعلق نہیں۔ (۱۳) صفحہ ۳۲ (سورہ ہود) کَانَ لَہُمْ یَغْنُوْا فِیْہَا لکھا ہوا ہے یعنی (یغنوا) میں ’ی‘ کے دو نقطوں کی جگہ ایک نقطہ ہے۔ اس لئے ’ی‘ کی جگہ ب پڑھی جاتی ہے۔

(۱۴) صفحہ ۳۲ (سورہ ہود) وَبَشِّرِ الْوَرْدَ لَمُورُودَ لکھا ہوا ہے۔ یعنی (المورود) کا الف وصل نہیں ہے۔

(۱۵) صفحہ ۳۳ مغاذ اللہ لکھا ہوا ہے۔ یعنی ’ع‘ کی جگہ ’غ‘ پڑھا جاتا ہے۔

(۱۶) صفحہ ۳۴ سطر ۹ (سورہ یوسف) اَوٰی اِلَیْہِ اَبُوْلَہ^{۲۲} لکھا ہوا ہے۔ یعنی (ابویہ) میں ’ی‘ کے نقطہ نہیں ہیں۔ حالانکہ اس سے نیچے کی سطر پر یہی لفظ پھر آیا ہے اور اس پر ”ی“ کے دونوں نقطے موجود ہیں۔

(۱۷) صفحہ ۳۶ (سورہ رعد) وَیَحَا فَوْنَ سَوَاءِ الْحِسَابِ لکھا ہوا ہے۔ یعنی ’خ‘ کا نقطہ نہیں ہے۔ ح پڑھی جاتی ہے۔

(۱۸) صفحہ ۳۵ (سورہ رعد) جَنَّتٌ عَدْنٌ یَدْخُلُوْنَہَا لکھا ہوا ہے۔ یعنی (یدخلونہا) میں ایک الف زائد لکھ دیا ہے۔ اس کا تعلق رسم خط سے نہیں ہے۔ یہاں الف کا کوئی کام ہی نہیں۔

(۱۹) صفحہ ۳۵ (سورہ ابراہیم) وَمَا کَانَ لَنَا اَنْ تَاْتِکُمْ بِسُلْطٰنٍ لکھا ہوا ہے۔ یعنی ’نَا تیکم‘ ہونا چاہیے تھا۔ نون کے ایک نقطہ کی جگہ دو نقطے بنا دیے ہیں۔ صیغہ متکلم کی جگہ صیغہ مخاطب ہو گیا ہے۔

(۲۰) صفحہ ۲۲ (سورہ بقرہ) مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِلّٰہِ وَمَلَائِکَہِ وَرُسُلِہِ وَجِبْرِیِّیْلَ وَہٰیكُمِیْلَ لکھا ہوا ہے۔ حالانکہ ہندوستانی و مصری قرآن شریف میں جبریل و میکیل ہے۔ یعنی دونوں جگہ ہمزہ نہیں ہے۔ قرآن شریف میں ان دونوں فرشتوں کے نام ہر جگہ بغیر ہمزہ کے آئے ہیں اور میکال میں ’ی‘ بھی نہیں ہے۔ نسخہ عالمگیری میں اس طرح پڑھا جاتا ہے۔ جس طرح عام طور پر بولتے ہیں۔ جبریل و میکائیل۔

(۲۱) صفحہ ۲۶ (سورہ یسین) اِنْ یَرِدَنَّ الرَّحْمٰنُ بِصُرٰلَا نَعْنٍ عَنِ شِفَا عَتَہِم لکھا ہے۔ یعنی ’نَعْنٍ‘ صحیح ہے۔ ایک نقطہ دینے کے سبب سے بجائے ’ت‘ کے بن گیا اور صیغہ حاضر کی جگہ صیغہ متکلم بن گیا۔

(۲۲) صفحہ ۲۸ (سورہ یسین) اَلَا وَحَمۃٌ مِّنَّا وَمَتَاعًا اَلِیْ حَیۡنٍ لکھا ہوا ہے۔ یعنی

(رحمة) کی رک جگہ (و) لکھنے سے معنی ہی بدل گیا۔

(۲۳) صفحہ ۶۲۸ (سورہ یٰسین) و ما تا تبھم من ابة من ایت ربھم لکھا ہوا ہے۔ یعنی ایک نقطہ کم لگانے سے ی کی جگہ ب پڑھی جاتی ہے۔

(۲۴) صفحہ ۶۳۰ (سورہ یٰسین) ولقد اضل منکم جبلا کثیرا ما ملہم نکونوا تعقلون لکھا ہوا ہے یعنی یہاں تحریر مخ ہو گئی ہے۔ اس طرح لکھنا چاہیے تھا (کثیرا اءافلم) اور بادشاہ نے اسی طرح لکھا بھی ہوگا۔ لیکن اتفاق سے غالباً قلمی نسخہ ہی میں رمز مطلق کی علامت (ط) آگے کے الف سے مل گئی اور اس کا اوپر کا حصہ مٹ گیا موجودہ صورت میں (کثیرا ما) پڑھا جاسکتا ہے (فلم) کی ف کا نقطہ بھی رہ گیا ہے۔

(۲۵) صفحہ ۸۳۲ (سورہ مدثر) و یزدا الذین امنوا یما نا لکھا ہوا ہے، حالانکہ صحیح (یزداد) ہے (اد) لکھنے سے رہ گیا۔ اگر حافظ یا عالم نہ ہو تو کون قاری اس غلطی کو پکڑ سکتا ہے یوں ہی پڑھ لے گا۔

یہ ۲۵ غلطیاں جو میں بطور نمونہ گنائی ہیں۔ نسخہ عالمگیری کی بیس صفحوں کی ہیں اور پورے قرآن مجید میں ۸۷۲ صفحے ہیں۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ باقی ۸۵۲ صفحوں میں کتنی ہو سکتی ہیں۔ قرآن مجید کی کتابت میں ایک نقطہ یا زیر برکی غلطی بھی بہت ہوتی ہے۔ ان غلطیوں میں بعض جگہ حرف یا لفظ ناتمام بنے چھپے ہیں۔ ان پر تو معمولی ناظرہ خواں بھی انک جائے گا اور سمجھ لے گا کہ لکھنے چھپنے سے رہ گیا۔ لیکن نقطوں کی کمی و بیشی اور لفظ کا رد و بدل ہر شخص محسوس نہیں کر سکتا۔

اب ناظرین غور کریں کہ غلطیوں کا یہ عالم ہے اور نظامی صاحب کا وہ جواب کہ رسم خط میں قدرے فرق ہو گیا ہے۔ اس ”قدرے فرق“ کے علاوہ کوئی غلطی نہیں ہے۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ اس موقع پر خط کوئی کے ذکر اور پہلے نقطہ و اعراب نہ ہونے کے تذکرہ کی کیا ضرورت تھی اور اس فقرے کا کیا محل تھا کہ ”جب قرآن شریف نازل ہوا تھا اور خط کوئی میں لکھا گیا تھا اگر اس قدیمی رسم خط کو آج کل کے خط سے مطابق کرنے کی کوشش کی جائے تو مطابقت قطعاً محال ہو جائے گی“ کیا خواجہ صاحب اس نسخہ عالمگیری کے خریداروں کو یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ جب قدیم وجدید رسم خط کی مطابقت محال ہے تو جو کوئی جیسا لکھ دے ٹھیک ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ اس نسخہ میں اول تو رسم خط کا اختلاف ہے ہی نہیں اور کہیں ہے تو وہ زیادہ قابل اعتراض نہیں۔ بڑی غلطیاں شہنشاہ غازی کے سہو کتابت یا قلمی نسخہ میں مٹ جانے اور ہلاک میں نہ چھپنے کے سبب سے ہیں۔ لیکن وہ اتنی زیادہ ہیں کہ ان پر اس طرح پردہ ڈالنا جیسا کہ خواجہ

صاحب نے ڈالنے کی کوشش کی ہے بڑا ظلم ہے۔

امید ہے کہ خواجہ صاحب میری صاف گوئی کو معاف فرمائیں گے۔ میری ان کی کبھی کی دید شنید بھی نہیں ہے اور مجھے تجارتی حدود رقابت کا موقع بھی نہیں ہے۔ میرا ان کا پیشہ الگ الگ ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ ان نسخوں پر ایک چٹ چھاپ کر لگا دی جائے اور اشتہار میں بھی لکھ دیا جائے کہ اس نسخہ میں غلطیاں موجود ہیں۔ اس کوئی غیر حافظ و عالم اس کوتلاوت کے لیے نہ خریدے۔ (۸ فروری ۱۹۳۹ء)

☆☆☆

(مکمل آیات کے نمبر درج ذیل ہیں)

- ۱۔ سورۃ البقرہ: ۵۳
- ۲۔ سورۃ البقرہ: ۱۲۲
- ۳۔ سورۃ ہود: ۸
- ۴۔ سورۃ ہود: ۳۹
- ۵۔ سورۃ ہود: ۶۸
- ۶۔ سورۃ ہود: ۹۸
- ۷۔ سورۃ یوسف: ۲۳
- ۸۔ سورۃ رعد: ۲۱
- ۹۔ سورۃ رعد: ۲۳
- ۱۰۔ سورۃ ابراہیم: ۱۱
- ۱۱۔ سورۃ البقرہ: ۹۸
- ۱۲۔ سورۃ یٰسین: ۲۳
- ۱۳۔ سورۃ یٰسین: ۴۴
- ۱۴۔ سورۃ مدثر: ۳۱
- ۱۵۔ سورۃ البقرہ: ۱۶

حضرت سلیمانؑ اور اُن کے گھوڑے

۱۶ ستمبر کے خیام میں شبلی صاحب بی کام مدیر خیام نے اپنے ”ذکر و فکر“ میں حضرت سلیمانؑ اور ان کے گھوڑوں کا واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ قرآن مجید کی آیت لکھ کر، اس کا ترجمہ کر کے اور تفسیر کے متعلق اختلاف رائے درج کر کے اپنا فیصلہ دے دیا ہے لیکن ایسی آسانی سے اس مسئلہ کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ میں عربی کا ماہر اور قرآن کریم کا عالم و مفسر نہیں ہوں۔ عربی کچھ خُدد بد جانتا ہوں اور مطالعہ قرآن میں طالب علم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا لیکن اپنی زندگی میں مجھے دو مضامین سے سب سے زیادہ دلچسپی رہی ہے۔ ایک شعر و ادب، دوسرا مذہب۔ قرآن مجید کی ایسی آیات و مسائل پر بھی میں نے بحثیں دیکھیں اور غور کیا ہے جن میں مفسروں کا اختلاف ہے۔ بعض اختلافات کی بنا پر مسلمانوں کے عقائد و اعمال میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ میں نے اپنی ”تاریخ اردو“ اور دوسرے مضامین میں سرسید، مولوی چراغ علی، ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ کی رائے پر تبصرہ بھی کیا ہے۔

یہ مسئلہ زیر بحث کوئی عقیدہ و عمل کا مسئلہ نہیں ہے۔ صرف محاورہ عرب اور روایت و درایت کی روشنی میں قرآن کریم کی اس آیت کا مفہوم متعین کرنا ہے لیکن اس میں اس قدر اختلاف ہے اور ایسی تاویلیں اور توجہیں کی گئی ہیں کہ اتنی آسانی کے ساتھ فیصلہ نہیں ہو جاتا جیسا شبلی صاحب نے سمجھ رکھا ہے۔ ان کو ایک رائے اختیار کرنے کا اختیار ہے۔ اس لئے کہ دونوں جانب صحابہ کرام اور علمائے عظام ہیں۔ شبلی صاحب جو فیصلہ پسند کریں گے۔ اس میں اقتدائے اسلاف کرام ہوگی لیکن ”ذکر و فکر“ کے لیے نام و وجہ و دلائل پیش کرنے چاہئیں تاکہ ہر شخص بجائے خود غور کر سکے۔ اس کام کے لئے نہایت تفصیل کے ساتھ لکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن نہ مجھے اتنی فرصت نہ خیام میں اتنی گنجائش۔ پھر بھی میں اپنی تحقیقات و معلومات کی بنا پر کچھ توضیح کرتا ہوں قرآن مجید کی آیہ کریمہ یہ ہے:

وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمَانَ ۖ لَإِنَّمَا أَتَا بِهٖ ۚ إِذْ عَرَضَ عَلَيْهِ بِالْعَظَمٰی
الصُّفٰیْنِ الْجَبَاۗءُ ۖ فَقَالَ إِنِّیْ أَحِبُّنَّ حُبَّ الْخَیْرِ عَنْ ذِکْرِ رَبِّیْ ۚ حَتّٰی

- ۱۶۔ سورۃ البقرہ: ۱۱
- ۱۷۔ سورۃ البقرہ: ۳۰
- ۱۸۔ سورۃ البقرہ: ۵۱
- ۱۹۔ سورۃ البقرہ: ۱۲۴
- ۲۰۔ سورۃ البقرہ: ۱۳۹
- ۲۱۔ سورۃ یونس: ۱۰۴
- ۲۲۔ سورۃ یوسف: ۹۹
- ۲۳۔ سورۃ یٰسین: ۴۶
- ۲۴۔ سورۃ یٰسین: ۶۲

☆☆

تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ۝ رُدُّوْهَا عَلَیَّ ۝ فَطَفِیقٌ مَسْحًا ۝ بِالسُّوقِ وَالْأَعْنَاقِ ۝
(سورہ ص۔ آیت نمبر ۲۹-۳۳)

اس کا ترجمہ شبلی صاحب نے اس رائے کے مطابق کیا ہے جس سے ان کو اتفاق ہے اور وہ یہ ہے:

”ہم نے داؤد کو سلیمان (فرزند) عطا کیا وہ نیک بندہ تھا۔ جب اس کے سامنے شام کے وقت اکیل اور سبک رو گھوڑے پیش کئے گئے تو وہ کہنے لگا۔ بے شک ان گھوڑوں سے میری محبت ذکر خداوندی ہی سے ہے۔ یہاں تک کہ وہ گھوڑے نظروں سے اوجھل ہو گئے تو سلیمان نے کہا۔ ان کو واپس لاؤ۔ پھر وہ ان کی پنڈلیاں اور گردنیں سہلانے لگا۔“

یہ ترجمہ علماء و مفسرین کی رائے کے خلاف ہے جیسا کہ شبلی صاحب نے لکھ دیا ہے اور اس اختلاف کی وضاحت کر دی ہے۔ اس میں شبلی صاحب کے قلم سے اِنَّ اَوَّابَ کا ترجمہ چھوٹ گیا ہے۔

(مسودے میں تو موجود ہے۔ افسوس کہ اب صاحب نظر انداز کر گئے (ش) جمہور علماء کا ترجمہ یہ ہے:

”اور ہم نے داؤد کو سلیمان (فرزند) عطا کیا۔ (سلیمان) اچھے بندے تھے کہ وہ ہمیشہ خدا کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ شام کے وقت اکیل اور سبک رو گھوڑے ان کے روبرو پیش کئے گئے (تو ان کے دیکھنے میں نماز عصر قضا ہو گئی) تو کہنے لگے کہ بے شک میں نے اپنے پروردگار کی یاد سے غافل ہو کر مال کی محبت کو ترجیح دی یہاں تک کہ آفتاب (مغرب کے) پردے میں چھپ گیا۔ ان گھوڑوں کو میرے پاس واپس لاؤ۔ اور اب گھوڑوں کی پنڈلیاں اور گردنیں کاٹنے لگے۔“

اس ترجمہ و تفسیر پر شبلی صاحب نے دو اعتراض کئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ شان پیغمبری کے خلاف ہے کہ حضرت سلیمان ہزاروں گھوڑوں کو ذرا سی بات کے لیے یوں ہلاک کر ڈالیں۔ دوسرے یہ گھوڑوں کا کیا قصور تھا؟ ذاتی تسامح کا انتقام حیوانوں سے کیونکر لیا جاسکتا ہے؟ لیکن یہ کچھ وزنی اعتراض نہیں ہیں۔ یہ ذرا سی بات نہ تھی یا دالھی سے غفلت اور نماز کا قضا ہونا تھا۔

پھر یہ کہ حضرت سلیمان صرف پیغمبر نہ تھے بادشاہ بھی تھے بادشاہ کے لیے یہ گھوڑے کیا مال تھے کہ ان کا بدل نہ ہو سکتا اور ان کے ضائع کرنے میں ان کو دریغ ہوتا۔

[تو گویا حضرت سلیمان ”نبی“ کم تھے اور بادشاہ زیادہ تھے؟ (ش)]

اس کے علاوہ یہ حیوانوں سے انتقام نہ لینا تھا۔ بلکہ اپنی غفلت کا کفارہ دینا تھا اور یاد الہی سے غافل کرنے والی محبوب شے کو قربان کرنا تھا۔ یہ تو حیوانوں کا قتل تھا دوسرے پیغمبروں نے تو غصے کے سبب یا اور کسی مصلحت کی بنا پر انسانوں کا قتل کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا ہے۔ حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کے کسی شخص کی حمایت میں اس کے دشمن قبطی کو مار ڈالا تھا۔ حضرت خضرؑ نے ایک بچے کو بے خطا و بے قصور ہلاک کر دیا تھا۔ اس لیے حضرت سلیمان کا یہ فعل قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتا۔

اب آیت قرآنی کے الفاظ و محاورات پر غور کیجیے۔ ان میں یہ باتیں فکر و نظر کے لائق ہیں:

(۱) احببت حب الخیر میں احببت کا مفہوم اور محل

(۲) عن ذکریٰ میں عن کا استعمال

(۳) حتی توارت بالحجاب حضرت سلیمان کا قول ہے یا واقعہ کا بیان۔ اور توارت کا فاعل کون ہے۔ اگر شخص فاعل ہے تو کس قاعدے سے مقدر مانا جاسکتا ہے۔

(۴) طَفِیقٌ کا محاورہ محل استعمال۔

(۵) مَسْحًا بالسُّوقِ وَالْأَعْنَاقِ کا محاورہ۔

ان امور پر بہت اختصار کے ساتھ بحث کرتا ہوں:

اول۔ حُب اور اس کے مختلف مصادر و مشتقات قرآن شریف میں درجنوں جگہ پر آئے ہیں لیکن ہر جگہ ایک ہی لفظ آیا ہے یعنی محبت کرنے کے معنوں میں ایک فعل اور اس کے بعد وہ شے جس سے محبت کرنے کا اظہار ہے۔ بطور مفعول۔ یہ محاورہ صرف اسی آیت زیر بحث میں ہے کہ محبت کو محبت کرنے کا مفعول کیا گیا ہے۔ یعنی حُب الخیر کے معنی ”مال کی محبت“۔ احببت حب الخیر کے لفظی معنی ہوئے ”میں نے مال کی محبت سے محبت کی“۔ یہاں محبت کرنے کے معنی ہیں غالب کرنے اور ترجیح دینے کے۔ یعنی ”میں نے حُب مال کو ترجیح دی“۔ اس لیے شبلی صاحب کا یہ ترجمہ کافی نہ تھا۔ ”ان گھوڑوں سے میری محبت“ بلکہ صحیح ترجمہ یہ تھا۔ ”ان گھوڑوں سے میری محبت کی ترجیح۔“

دوم۔ عن بہت سے معنوں میں آتا ہے۔ ان میں ایک ”تعلیل“ بھی ہے جو شبلی صاحب کے ترجمہ میں مراد ہے لیکن قرآن کریم میں عن کا لفظ ذکر کے ساتھ سات جگہ آیا ہے اور ایک جگہ بھی ”تعلیل“ کے لیے نہیں ہے بلکہ ”مجازۃ“ (الگ ہونے) کے معنوں میں آیا ہے۔ مثلاً وَیَصُدُّ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ (اور تم کو ذکر الہی سے روکتا ہے) عَنْ ذِکْرِ رَبِّہِم مَّعْرُضُونَ۔ (اپنے رب

کے ذکر سے اعراض کرتے ہو)۔ و من یغشی عن ذکر الرحمن تقیض له شیطانا (اور جو شخص ذکر الہی سے اغماض کرتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں) اسی طرح باقی آیتیں ہیں۔

قرآن کریم میں ذکر اللہ کے ساتھ حسب موقع و مفہوم مختلف حروف جارہ آئے ہیں۔ بذکر اللہ، من ذکر اللہ، الی ذکر اللہ، لذکر اللہ، ان میں ”سبب اور واسطے“ کے لئے ب اور ل آئے ہیں۔ وَ تُطْمِن قُلُوبُهُمْ بذکر اللہ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے مطمئن ہوتے ہیں۔ بے شک اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوا کرتا ہے)۔ کہیں سب اور علت کے لیے عن ذکر اللہ نہیں آیا۔

اس محاورہ قرآنی کے سبب سے آیت زیر بحث میں بھی احببت حب الخیر عن ذکر ربی میں بھی عن ذکر ربی کے معنی ہونے چاہئیں۔ ”اپنے رب کے ذکر سے غافل ہو کر۔“ سوم۔ حتی توارت بالحجاب کو اگر حضرت سلیمان کا قول نہ مانا جائے بلکہ واقعہ کا بیان سمجھا جائے تو اس سے قبل وبعد جو حضرت سلیمان کے الفاظ ہیں ان کے بیچ میں یہ بیان حاکم ہوتا ہے لیکن اگر یہ بھی انھی کا قول ہو تو انسی احببت سے رُذُوحَا عَلٰی تک مسلسل تقریر ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ میرے ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کو پھر پڑھ کر دیکھیے۔

توارت کا فاعل بننے کے لئے شمس کا لفظ موجود نہیں ہے لیکن آیت میں جو عیسیٰ (بعد ظہر کا وقت) ہے وہ قرینہ ہے کہ سورج کا چھپ جانا مراد ہے اور اتنا قرینہ بالکل کافی ہوتا ہے۔ اکثر مفسروں نے اس کو تسلیم کیا ہے۔

چہارم۔ طفق مستقل فعل کی طرح بھی آتا ہے جیسے طفق ہمارا (اپنی مراد حاصل کر لی) یا طفق الموضع (جگہ پکڑ لی کسی مقام پر جم گیا) اور فعل کی حالت ظاہر کرنے کے لئے اس فعل کے ساتھ بھی آتا ہے۔

قرآن مجید میں صرف دو جگہ یہ لفظ آیا ہے اور دونوں جگہ حالت فعل کے اظہار کے لئے آیا ہے۔ اس محل پر طفق کسی کام کے شروع کرنے کے لئے آتا ہے اور صرف شروع کر دینا نہیں بلکہ کرتے رہنا۔ اور وہ بھی علی الاتصال یا عجلت کے ساتھ۔ اس آیت کے علاوہ دوسری آیت یہ ہے جس میں حضرت آدم اور حضرت حوا کے شجر ممنوعہ کھانے کے بعد کا حال ہے۔ وَ طَفِقَا يَخْضِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَرَقِ الْجَنْجَةِ (اور وہ دونوں اپنے بدن پر جنت کے پتے چکانے لگے) دونوں آیتوں میں فعل کی حالت یکساں ہے جس طرح حضرت آدم و حوا نے لگاتار پتے

چکانے شروع کئے۔ اسی طرح حضرت سلیمان نے جلدی جلدی گھوڑوں کی ساق و گردن پر ہاتھ مارنے شروع کیے۔ اب اگر غصے سے ساق و گردن کو اڑانا مفہوم نہ ہو بلکہ چکارنا اور ہاتھ پھیرنا مراد ہو تو نہ علی الاتصال اس کام کے کرنے کی ضرورت نہ ہزاروں میں سے ہر ایک گھوڑے کے ساتھ محبت کا اظہار ممکن۔ اور نہ اتنے سے کام کے لیے گئے ہوئے گھوڑوں کو واپس طلب کرنے کا کوئی سبب۔ گھوڑوں کو پھر طلب کرنا کسی اہم کام کے لئے ہونا چاہئے۔ جس کا بعد کو یکا یک خیال آیا ہو۔

پنجم۔ مسح کے معنی چھونے اور ہاتھ پھیرنے ہی کے ہیں لیکن اعناق کے ساتھ آتا ہے تو محاورے میں گردن اڑانے کے معنی ہوتے ہیں۔ یہ عرب کا عام محاورہ ہے۔ اسی طرح ”ضرب“ کے معنی صرف مارنے یا چوٹ لگانے کے ہیں۔ لیکن اعناق کے ساتھ قتل کے معنی ہوتے ہیں۔ ہم اردو کے محاورے میں بھی ”گردن مارنا“ کہتے ہیں۔

ان قرآن دلائل کی بنا پر اکثر علما کی یہی رائے ہے کہ گھوڑوں کو ہلاک کرنا مراد ہے دوسری رائے رکھنے والوں کے لئے اس آیت میں سب سے قوی قرینہ توارت بالحجاب کا ہے۔ کہ توارت کی ضمیر نہایت آسانی سے الضیفنٹ الجیار (یعنی گھوڑوں) کی طرف راجع کی جاسکتی ہے۔ شمس کے لیے قرینہ بعید پیدا کرنا پڑتا ہے۔

بہر حال یہ اختلاف قرن اول سے آج تک چلا آتا ہے۔ ہندوستان کے مترجمین و مفسرین میں شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب بھی گھوڑوں کا ہلاک کرنا مراد لیتے ہیں۔ ان کے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز صاحب اور ان کے والد محترم شاہ ولی اللہ صاحب بھی یقیناً اسی طرف گئے ہوں گے۔ ان کی تفسیریں میرے پیش نظر نہیں ہیں۔ مولوی فتح محمد خان صاحب جالندھری اور ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی بھی یہی رائے ہے۔ نذیر احمد صاحب نے حاشیہ پر لکھ دیا ہے کہ ترجمہ جمہور کے مطابق کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا دوسرا مفہوم بھی ہو سکتا ہے۔ البتہ مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی نے ساق و گردن کو سہلانا ہی مراد لیا ہے۔ علمائے دیوبند کے ترجمے مجھے نہیں ملے۔

☆☆

(اس مضمون میں چونکہ شبلی بی۔ کام کے مضمون پر اعتراضات کئے گئے تھے تو جواب الجواب کے طور پر شبلی نے درج ذیل حواشی لکھے۔)

(۱) پچکارنے اور سہلانے کے لیے جلدی جلدی ہی ہاتھ مارنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ قتل کے لئے تو ایک واقعہ بھرپور وار کافی ہے۔ (ش)

(۲) ہزاروں میں سے ہر ایک گھوڑے کو قتل کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ اگر ایک گھوڑے کی گردن اور پنڈلیاں ایک منٹ کے اندر بھی اڑائی جاسکیں تو بیس ہزار گھوڑوں کو قتل کرنے کے لیے برابر ۱۴ دن درکار ہیں۔ کیا حضرت سلیمان دو ہفتے تک دن رات اسی بے معنی قتل میں مصروف رہے اور ان کا جوش انتقام پھر بھی ٹھنڈا نہ ہوا؟ حضرت سلیمان خدا کے ایک برگزیدہ نبی تھے۔ وہ عام لوگوں کی طرح اتنے مغلوب الغضب نہیں ہو سکتے۔ (ش)

(۳) کیا اظہار محبت ایک اہم کام نہیں ہے خصوصاً جب وہ ذکر الہی کا اب تک حصہ ہو اور جس کا خیال انھیں مراقبے کے بعد آیا۔ (ش)

(۴) ”اعتناق“ سے پہلے ”سوق“ بھی ہے۔ کیا ”مسح بالسوق“ کے معنی پنڈلیاں اڑانا ہے؟ اور یہ کوئی محاورہ ہے؟ ”مسح“ کے سیدھے سادے معنی کیوں نہ لیے جائیں۔ خصوصاً جب اس سے حضرت سلیمان کی مہارت فن کا اظہار ہوتا ہے اور وہ قتل و انتقام کے الزام سے محفوظ رہتے ہیں (ش)

(خیام لاہور یکم نومبر ۱۹۴۶ء)

☆☆

شاہد۔ مبشر۔ نذیر

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝

(اے پیغمبر ہم نے آپ کو گواہ اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔) امت نے اپنے پیغمبر اعظمؐ اپنے رسول مکرمؐ اپنے نبی محترمؐ اپنے ہادی مختصمؐ کی مدح و ثنا میں دفتر کے دفتر لکھے، قصیدوں پر قصیدے کہے، غزلوں کے انبار لگا دیئے رباعیوں کے خزانے بھر دیئے۔ اور اس شان سے لکھے اس زور سے کہے کہ ایمان کی بات یہ ہے کہ ایمان چمک اٹھا اسلام روشن ہو گیا لیکن یہ وہ حق نہ تھا جو ادا ہو سکتا۔ یہ وہ داستان نہ تھی جو تمام ہو سکتی۔ جو کچھ لکھا اور جتنا کچھ کہا سمندر کے آگے ایک قطرے اور آفتاب کے سامنے ذرے سے زیادہ نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے اور واقعہ یہی ہے کہ

خدا خود مدح خوان مصطفیٰ بس

جس نے پیدا کیا جس نے رسول بنا کر بھیجا وہی جان سکتا ہے کہ کس کو رسول بنا کر بھیج رہا ہے اور وہی سمجھ سکتا ہے کہ اس نبی کی کیا شان ہے، کیا مرتبہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کریمؐ کا ذکر جن الفاظ کے ساتھ کیا ہے، جو شانیں بیان کی ہیں۔ جو اوصاف بیان کیے ہیں لگتا ہے وہ سادہ الفاظ ہیں، سیدھی باتیں ہیں، آسان کلام ہے، لیکن ان کے اندر جو معانی پوشیدہ ہیں جو اسرار مخفی ہیں جو کرامتیں پنہاں ہیں وہ نہ تقریر میں آسکتے ہیں نہ تحریر میں ساسکتے ہیں۔ ان کے لیے نہ دفتر کافی نہ منبر کافی۔ تاہم علماء کمال، نبیاء نے ان میں سے بعض رموز اور چند نکتے سینوں سے سفینوں میں لکھ دیے ہیں۔ جو تازگی ایمان کا باعث اور سرور دل و جان کا موجب ہیں۔

علامہ ابن جوزیؒ نے اس آیت کریمہ کی (جو عنوان پر درج کی گئی ہے) تفسیر نہایت لطیف پیرایہ میں بیان کی ہے۔ ان کا اسلوب بیان اس قدر دلکش اور الفاظ تفسیری اس درجہ خوبصورت ہیں کہ صرف ترجمہ لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ علامہ مغفور کے الفاظ بھی دیکھیے اور ترجمہ بھی پڑھیے:

(۱)

قوله تعالى يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا لِلرُّسُلِ
بِالتَّبْلِيغِ وَ مُبَشِّرًا لِّمَنَ آمَنَ بِالْحَنَّةِ وَ نَذِيرًا لِّمَنَ كَذَّبَ بِالنَّارِ
(اے نبی ہم نے آپ کو گواہ بنا کر بھیجا یعنی رسولوں کے لیے تبلیغ کی گواہی دینے والا اور ایمان
لانے والوں کو جنت کی خوشخبری دینے والا اور تکذیب کرنے والوں کو دوزخ سے ڈرانے والا۔)

(۲)

قوله تعالى شاهدا على العامة و مبشرا بالكرامة و نذيرا
الفرامة و داعيا للسلامة و سراجا منيرا لاهل الاستقامة۔
(شاہد یعنی سب پر گواہی دینے والا مبشر یعنی بزرگی و کرامت کی خوشخبری دینے والا نذیر یعنی سزا و عذاب
سے ڈرانے والا اور سلامتی کی طرف بلانے والا اور راہ راست پر چلنے والوں کے لیے روشن چراغ۔)

(۳)

قوله تعالى انا ارسلناك شاهدا اے شاهدا الانبياء و مبشرا
الاولياء و نذيرا الاشقياء و داعيا للاتقيا و سراجا منيرا الاصفياء
(ہم نے آپ کو گواہ بنا کر بھیجا یعنی انبیاء کے لیے گواہ اولیاء کے لیے بشارت دینے والا اشقیاء
کیلئے ڈرانے والا اتقیا کے لیے دعوت حق دینے والا۔ اصفیاء کے لیے روشن چراغ۔)

(۴)

انا ارسلناك شاهدا اے شاهد اعلی الشهود و مبشرا لاهل
السجود و نذيرا لاهل الجحود و داعيا الى المعبود و سراجا
منيرا على الصراط يوم الودود۔

(ہم نے آپ کو گواہ بنا کر بھیجا یعنی گواہوں کی گواہی دینے والا سجدہ کرنے والوں کو خوشخبری
دینے والا انکار کرنے والوں کو ڈرانے والا معبود کی طرف بلانے والا قیامت کے دن پل صراط پر
روشن چراغ۔)

(۵)

شاهدا اے شاهدا للعابدين و مبشرا للموحدين و نذيرا
للجاهدين و داعيا للمريدین و سراجا منیر اللواجدین۔
(یعنی عبادت کرنے والوں کے لیے گواہ توحید پرستوں کے لیے خوشخبری دینے والا اہل
ارادت کو دعوت دینے والا اور اللہ تک پہنچنے والوں کے لیے روشن چراغ۔)

(۶)

يا ايها النبي انا ارسلناك اے بعثناك شاهدا النوا و مبشرا
منا و نذيرا ابنا و داعيا اليها و سراجا لكوننا و منيرا على وجودنا۔
(اے نبی ہم نے آپ کو بھیجا یعنی مبعوث کیا اپنا گواہ بنا کر اپنی طرف اسے خوشخبری دینے والا
ہم سے ڈرانے والا ہماری طرف بلانے والا۔ ہماری ہستی کے لیے چراغ اور ہمارے وجود پر روشنی
ڈالنے والا۔)

(غیر مطبوعہ)

☆☆☆

۱۔ سورۃ احزاب آیت نمبر ۴۵

۲۔ عبدالرحمن بن علی بن محمد ابوالفرج جمال الدین القرشی الکبریٰ الحسینی البغدادی۔ حنبلی
مسک کے مشہور فقیہ تھے۔ ۵۱۰ھ (۱۱۱۶ء) کو بصرہ کے قریب ایک محلہ جوزہ میں پیدا ہوئے۔ اسی
نسبت سے انھیں ابن جوزی کہا جاتا ہے۔ تین سال کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ والدہ اور چچو بھی نے
ابتدائی تربیت کی۔ انھوں نے متداول علوم اپنے وقت کے اکابر علماء سے پڑھے۔ اپنے
فصیح و بلیغ اور عالمانہ مواعظ کی بدولت شہرت پائی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے درس میں پانچ سو ہزار
لوگ ہوتے تھے اور وعظ کے دوران یہ تعداد ایک لاکھ تک پہنچتی۔ ایک لاکھ کے قریب لوگوں نے
ان کے ہاتھ پر گناہوں سے توبہ کی۔ انھوں نے بغداد میں ایک مدرسے کی بنیاد رکھی اور یہیں اپنے
مواعظ کے دوران قرآن مجید کی تفسیر مکمل کی۔ علامہ ابن جوزی نے ۵۹۷ھ (۱۲۰۰ء) میں بغداد
کے مقام پر وفات پائی۔

☆☆

عَلَّمُوهُ النَّاسَ فَإِنِّي أَمْرٌ مَقْبُوضٌ وَالْعِلْمُ سَيَنْقَبِضُ حَتَّى يَخْتَلِفُ
اثنان فِي فَرِيضَةٍ لَا يَحْدَانِ أَحَدًا يَفْصِلُ بَيْنَهُمَا۔

(ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ علم سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ۔ احکام و فرائض سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ۔ قرآن سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ۔ کیونکہ میں دنیا سے اٹھ جانے والا ہوں اور علم بھی عنقریب اٹھ جانے والا ہے۔ یہاں تک کہ دو شخص فرائض میں اختلاف کریں گے اور کسی ایسے شخص کو بتائیں گے جو ان کے اختلاف کو مٹا دے اور صاف فیصلہ کر دے۔)

ان ارشادات سے زیادہ صاف و صریح مذہبی تعلیم کا حکم کیا جا رہا ہے اور ان فرمانوں سے قوی تر مذہبی تعلیم کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟ تاہم ان کی تفصیل و تشریح سمجھنے کے لیے چند باتیں یاد رکھنی ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ اس زمانے کے مفکرین و مصلحین کی سب سے بڑی غلطی جس سے اسلام اور مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچا ہے یہ ہے کہ انھوں نے دین و دنیا کو الگ الگ سمجھا ہے بلکہ ایک کو دوسرے کی ضد تصور کر لیا ہے۔ گویا منطق حیات کے یہ دونوں ضلع (دنیادین) دو جدا گانہ چیزیں ہیں اور ان میں مانعہ الجمع کی نسبت ہے کہ دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ حالانکہ میں کہتا ہوں کہ ان دونوں میں شیر و شکر کی نسبت ہے۔ (اگر منطق نسبتوں کے مقابلے میں اس قسم کی ادبی و شعری نسبت کرنے کا مجھے اختیار دیا جائے)۔ یعنی یہ دونوں شیر و شکر کی طرح ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ میرے اس دعوے کا ثبوت یہ مشہور ارشاد ہے اللہ دنیا مزرعة الاخرة (دنیا آخرت کی کھیتی ہے)۔ اس مقولہ کا صحیح مفہوم سمجھنے میں اور اس کو صحیح موقع پر استعمال میں اکثر غلطی کی جاتی ہے۔ اکثر اس قول کو ان معنوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ دنیا نہایت حقیر چیز ہے، قابل التفات نہیں اور یہ سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے کہ دنیا کی کھیتی ترک دینا ہے۔ حالانکہ تین لفظوں کا جملہ اس قدر بلیغ واقع ہوا ہے کہ گویا دین و دنیا و آخرت کا پورا نظام عمل تار کے لفظوں میں جمع کر دیا گیا ہے یعنی دین ختم ہے دنیا اس بیج کے جو تنے بونے کا کھیت ہے۔ اور آخرت کا تنے اور خرمن جمع کرنے کا وقت ہے۔ اب سمجھیے کہ دین کیا ہے؟ دین نام ہے ایمان اور عمل صالح کا۔ عمل صالح کیا ہے؟ تمام فرائض انسانی کا ادا کرنا۔ فرائض انسانی کیا ہیں؟ تمام حقوق اللہ و حقوق العباد۔ حقوق العباد کی وسعت و کثرت کا کیا ٹھکانا ہے؟ بادشاہ اور رعایا، مخدوم و خادم، سرمایہ دار و مزدور، تاجر و صنّاع، معلم و متعلم، ماں باپ، زن و فرزند، اعزہ و احباب، دوست و دشمن کے

دنیوی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کی ضرورت

حضرات دنیوی تعلیم کے ساتھ مذہبی کی ضرورت کی پہلی سی دلیل تو یہ آسان منطقی قضیہ ہے کہ اگر مذہب کی ضرورت ہے تو اس کی تعلیم کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن مذہب کی ضرورت مسلم ہے تو مذہبی تعلیم کی ضرورت بھی مسلم ہے۔

مجھے غالباً اطراف قضیہ کی شرائط صداقت پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر مجمع میں سب حضرات کے نزدیک مذہب بھی انہیں باتوں میں ہوگا جو بغیر تعلیم کے نہیں آسکتیں اور کوئی صاحب ایسے بھی ہوں گے جو مذہب کی ضرورت کو تسلیم نہ کرتے ہوں۔ لیکن موضوع زیر بحث کے لیے صرف اتنی بات کافی نہ سمجھی جائے گی۔ تو میں دعوے کی تصدیق کیلئے ابتدا میں پھر اختصار ہی سے کام لیتا ہوں اور صرف ایک آیت کریمہ اور ایک حدیث شریف پیش کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ کا ارشاد ہے:

لَيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلْيُبْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ۔

یعنی ”کہ دین کی سمجھ پیدا کریں اور جب (سیکھ سمجھ کر) اپنی قوم میں واپس جائیں تو ان کو (نافرمانی خدا سے) ڈرائیں۔“

نبی کریم ﷺ کا فرمان مبارک ہے:

عن ابن مسعود قال قال لي رسول الله ﷺ تَعَلَّمُوا الْعِلْمَ وَ

عَلَّمُوهُ النَّاسَ، تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَعَلَّمُوهُ النَّاسَ تَعَلَّمُوا الْقُرْآنَ وَ

حقوق اس طرح ادا کرنا کہ عمل صالح کہلائے جاسکیں اور ایمان و عقائد کو درست رکھنا یہ دین ہے تو اب الدنیا مزدرة الاخرة کے مفہوم پر غور کیجیے یعنی آپ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج ادا کریں بلکہ اگر ہمت ہو تو نوافل و تہجد گزاری کے ساتھ جیسے آپ کے حالات اور ضروریات ہوں۔ نوکری کیجیے یا تجارت، انگریزی پڑھیے یا عربی، کونسل اور اسمبلی کی ممبری کیجیے یا لیڈری، جو چاہے کیجیے اگر ایمان و دیانت پر قائم رہ کر کیجیے گا تو دنیا بھی آپ کی اور آخرت بھی آپ کی۔ انسان جس قدر دنیا سے الگ تھلگ رہے گا اعمال صالحہ کے مواقع ہاتھ سے کھو دے گا اور اعمال صالح کو ہاتھ سے چھوڑنا آخرت کے ثواب و نفع سے ہاتھ اٹھانا ہے۔

مذہبی تعلیم کے متعلق دوسری بات ذہن نشین رکھنے کے قابل یہ ہے کہ مذہبی تعلیم کے دو اجزاء ہیں۔ ایک احکام و فرائض ضروری کا جاننا۔ دوسری تفقہ فی الدین پیدا کرنا یعنی تفسیر و حدیث و فقہ وغیرہ تمام علوم دینی میں کمال و تبحر حاصل کرنا اور محدث و مفتی کے مرتبہ تک پہنچنا۔ ان میں سے پہلا جز یعنی مذہبی عقائد و اعمال کے ضروری مسائل سے واقف ہونا فرض عین ہے۔ ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے اور دوسرا جز و عالم و مفتی بننا فرض کفایہ ہے۔ کافۃ الناس اور عامۃ المسلمین یہ درجہ علم و فضل حاصل نہیں کر سکتے لیکن ہر زمانے میں ہر ملک میں بلکہ ہر شہر میں علمائے دین کا ہونا ضروری ہے۔ اسی کی طرف اس حدیث شریف میں اشارہ ہے:

عن ابی سعید الحدری قال قال رسول اللہ ﷺ ان الناس لکم تبع و ان الرجال یا تو نکم من اقطار الرض یتفقہون فی الدین فاذا اتو کم فاستوصو ابہم خیرا۔

(ابو سعید حدری کہتے ہیں جناب رسول اللہ ﷺ نے (صحابہ سے مخاطب ہو کر) فرمایا کہ لوگ تمہارے تابع ہیں اور بہت سے آدمی دین میں سمجھ پیدا کرنے کے لیے تمہارے پاس آئیں گے تو جب وہ تمہارے پاس آئیں تو ان کے ساتھ نیکی کرنے میں تم میرا حکم مانو۔)

نیز دوسری حدیث میں وارد ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہے:

لا یزال من امتی اُمَّةٌ قائمًا یا من اللہ لا یضرُّ منُ خَدَّ لہُم ولا من خالفہُم یا تی امر اللہ و ہم علی ذلک۔

(میری امت میں سے ایک جماعت حکم خدا (یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر) پر قائم رہے گی۔ لوگوں کی تذلیل سے ان کو نقصان پہنچے گا نہ لوگوں کی مخالفت سے یہاں تک کہ قیامت آجائے گی اور وہ اپنے اسی کام میں لگے ہوں گے۔)

اب دنیاوی تعلیم کی اہمیت کو ملاحظہ فرمائیے کہ اگر ضروری مسائل دینی کی تعلیم سے موقوف ہو جائے تو مسلمانوں کا ایمان سلامت بچانا بھی مشکل ہے اور اگر تفقہ فی الدین کی تحصیل بند ہو جائے تو علم و فضل، ارشاد و ہدایت، قضا و افتاد کا خاتمہ ہے۔

لیکن میں اس سے بھی بڑھ کر کہنا چاہتا ہوں۔ میری نظر میں دنیوی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کی اس قدر اہمیت اور اس درجہ ضرورت ہے کہ صرف ابتدائی مدرسوں اور ہائی اسکولوں تک محدود نہ رہنی چاہیے بلکہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی لازمی قرار دی جائے۔ ایف۔ اے اور بی۔ اے کے دیگر مضامین انگریزی، تاریخ، فلسفہ، سائنس وغیرہ کے ساتھ ایک مضمون مذہبی تعلیم بھی ہو یعنی ایک طالب علم ابتدائی مدرسہ میں امنٹ بال اللہ اور کلمہ شریف کے معنی اور نماز و وضو کے مسائل سے شروع کر کے بی اے کی سند حاصل کرنے تک قرآن اور حدیث اور فقہ اور اسلامیات اور تاریخ و سیر میں کافی و ضروری بصیرت حاصل کر سکے اور آگے ایم اے کے امتحان میں جہاں صرف ایک مضمون میں تکمیل کی جاتی ہے کسی دوسری زبان یا مضمون کی جگہ مذہب کے کسی شعبہ میں درجہ فضیلت حاصل کر لے۔

میرے نزدیک مذہبی تعلیم اتنی ضروری ہے کہ ایک طالب علم اسکول یا کالج کی تعلیم کے بعد کوئی ملازمت، کوئی پیشہ، کوئی کاروبار کرنا چاہے اس کے لیے دینی تعلیم واجب ہے۔ ممکن ہے دوسرے مذاہب والے میری اس رائے سے اختلاف کریں اور اپنے مذہب کی تعلیم کو زندگی کے اعمال و مشاغل کے لیے ضروری و مفید تصور نہ کریں۔ ان کو اختیار ہے لیکن میں اسلام کی طرف سے نہایت یقین و وثوق کے ساتھ یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مذہبی تعلیم حاصل کر کے مسلمان بہتر بادشاہ، بہتر رعایا، بہتر حاکم، بہتر محکوم، بہتر کارخانہ دار، بہتر مزدور، بہتر سوداگر، بہتر کاریگر، بہتر لیڈر، بہتر شہری، بہتر ہمسایہ، بہتر دوست، بہتر ماں باپ، بہتر اولاد، غرض بہتر انسان بن سکتے ہیں۔

اس بہتری کی اصل اور راز کچھ پیچیدہ نہیں ہے۔ سیدھی سی بات ہے۔ مذہبی احکام و فرائض سے واقفیت، قرآن مجید اور حدیث شریف کا علم، ہادی برحق رسول خدا ﷺ اور اصحاب و ائمہ اور اہل اللہ اور بزرگان دین کی مقدس سیرت کا مطالعہ، تاریخ اسلام سے آگاہی کا لازمی نتیجہ ہوگا ان

چیزوں سے دلی لگاؤ اور محبت۔ محبت اور تعلق کا فطری تقاضا ہے پیروی و اقتداء پیروی و تقلید کے لیے ناگزیر ہے اپنی اصلاح حال۔ دھواں مقصود اور کیا چاہیے۔

کسی بزرگ کا ارشاد ہے کہ انسان کتنا ہی مغرور و خود سر ہو اس دنیا سے اپنے آپ کو بڑا اور بہتر سمجھتا ہو اور ہر شخص کو حقارت سے دیکھتا ہو اگر صرف کسی ایک ہستی کو اپنے سے بہتر مان لے اور اپنا محبوب و مطلوب بنالے تو رفتہ رفتہ اس کو یہ خیال پیدا ہوگا کہ اس شخص کے اہل و عیال بھی مجھ سے بہتر ہیں۔ پھر یہ سوچے گا کہ اس کے عزیز و احباب بھی مجھ سے بہتر ہیں۔ پھر یہ احساس پیدا ہوگا کہ اس کے نوکر چاکر بھی مجھ سے بہتر ہیں۔ پھر یہ جذبہ پیدا ہوگا کہ یہ شخص جو چیزیں پسند کرتا ہے وہ پسند کے قابل بھی ہیں جن سے نفرت کرتا ہے وہ لائق ترک ہیں۔ اسی طرح آہستہ آہستہ اس کی ہستی محبوب کی ہستی میں جذب ہو جائے گی اور خود بخود اصلاح حال ہو جائے گی۔ یہ سب کچھ اسی تعلق اور وابستگی کا نتیجہ ہے۔

اس کو دنیا کی مثالوں سے سمجھیے۔ ایک شخص ہے جو تنہا کسی کچہری یا کارخانہ دفتر یا مدرسہ میں ملازم ہے۔ بچھے گھسنے اور آٹھ گھسنے محنت کرتا ہے، کماتا ہے اور کھاتا ہے، کچھ عرصہ بعد شادی کر لیتا ہے، بیوی گھر میں آتی ہے۔ اب یکا یک اس کی حالت بدل جاتی ہے اس کی محنت و مشقت اور جانفشانی وہی ہے جو پہلے تھی۔ لیکن اب اس کا شریک زندگی پیدا ہو گیا۔ اب وہ اپنے لیے نہیں بلکہ دوسرے کے لیے محنت کرتا ہے اب اس کو اس محنت میں بھی مزہ آتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اب اس کی یہ مشقت کسی محبوب ہستی کی راحت کے لیے ہے لیکن اگر اس کو یہ بھی معلوم ہو کہ بیوی کی راحت کے لیے محنت مزدوری کرنا اللہ کے نزدیک عبادت اور قابل اجر و ثواب ہے تو اس کی محنت کو چار چاند لگ جائیں۔

ایک اور پہلو سے دوسری مثال ملاحظہ کیجیے۔ ایک شخص ہے مفلس و محتاج، کئی کئی دن فاقے کرنے پڑتے ہیں اسی حالت میں رمضان کا مہینہ آ جاتا ہے اور وہ روزے کی نیت کر لیتا ہے۔ اس کی فاقہ کشی وہی ہے جو پہلے تھی لیکن اب:

ع۔۔۔۔۔ فاقوں میں بھی اک طرح کی لذت آتی

کیوں؟ اس لیے کہ اب یہ فاقہ مذہبی حکم کی تعمیل ہے۔ یہ فاقہ خدا کو پسند ہے۔

اس تقریر سے میرا مقصد یہ ہے کہ مذہب سے تعلق اور لگاؤ ہماری تمام زندگی اور تمام لائحہ عمل پر موثر ہو سکتا ہے۔

اب ذرا سرسری طور پر اس بات پر غور کر لینا چاہیے کہ مذہب اور مذہبی تعلیم کی طرف سے

موجودہ عام بے اتفاقی کا سبب کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ مذہب کا قیام و بقا مذہب کی حفاظت و حرمت مذہب کا رواج و پابندی مذہب کی تعلیم و اشاعت اصل میں حکومت کی سرپرستی حکومت کی کوشش حکومت کے اختیار سے ہو سکتی ہے اور ہوئی ہے اور ہندوستان میں حکومت غیر مذہب والوں کی ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان کے اختلاف مذاہب و عقائد کو دیکھ کر اپنی اور حکومت کی اور ملک و رعایا کی عافیت اسی میں دیکھی کہ ہندوستان کے کسی مذہب میں کوئی دخل نہ یاد جائے اور اس میں شک نہیں کہ یہ ان کی بہت بڑی دانشمندی تھی اور اس کے سبب سے ہندوستان کے تمام مذاہب انگریزوں کے شکر گزار ہیں لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں نے ہندوستان میں جو تعلیم رائج کی اس سے مذہبی تعلیم کو خارج کیا اور اہل ہند کو حکومت کے اسکولوں اور کالجوں میں اسی نصاب تعلیم کو پڑھنا لازم تھا۔ اہل ہند کی تعلیم خود حکومت کو بھی اپنے کاروبار سلطنت کے لیے مفید و لازم تھی اور اہل ہند کو بھی اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ چنانچہ اس ستر، اسی برس کے عرصہ میں ہوتے ہوتے یہ حالت ہو گئی کہ مذہبی تعلیم کے لیے فرصت ہی نہ رہی اور کاروبار دنیا کے لیے اس کی ضرورت کا بھی احساس جاتا رہا۔ اب مذہبی تعلیم صرف مذہب کی خاطر رہے گی اور مذہبی تعلیم کی یہ اہمیت نظر انداز ہو گئی کہ مذہبی تعلیم اور مذہبی پابندی خود اعمال حیات اور معاملات دنیوی کی اصلاح و فلاح کے لیے بھی مفید و ضروری ہے۔ مثلاً اب اگر کوئی شخص چوری نہیں کرتا تو مذہب کے خوف سے نہیں بلکہ سرکاری قانون کے ڈر سے باز رہتا ہے کہ پکڑا جاؤں گا تو قید بھگتنی پڑے گی لیکن قانون کا خوف اصلی خوف نہیں ہے۔ قانون کی گرفت سے آدمی بچ ہی جاتا ہے۔ اصلی ڈر خدا کا ڈر ہے۔ اسی طرح کتنے گناہ کبیرہ اور سخت جرائم ہیں کہ قانون میں اس کی گرفت نہیں تو اب ان سے اجتناب کا ذریعہ مذہبی تعلیم اور مذہبی پابندی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

دوسرا سبب مذہب اور مذہبی تعلیم سے بے پروائی کا یہ ہے کہ سرکاری مدرسوں اور اسکولوں کالجوں کی تعلیم میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے مثلاً تاریخ، جغرافیہ، حساب، ریاضی، سائنس وغیرہ یہ سب چیزیں ایسی ہیں جو مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہیں۔ مثلاً اقلیدس کا دعویٰ ہے کہ مثلث کے دو ضلع مل کر ہمیشہ تیسرے ضلع سے بڑے ہوتے ہیں۔ اس کو ہر شخص ناپ کر دیکھ سکتا ہے۔ زمین کا گول ہونا اس طرح ثابت کیا جاتا ہے کہ گویا آنکھوں دیکھی بات ہے۔ سائنس کے تجربے اپنی ہدایت و صداقت کے لیے مشہور ہی ہیں لیکن اس کے برخلاف مذہب کے بہت سے اہم مسائل ایسے ہیں کہ مشاہدہ و تجربہ سے انکی تصدیق نہیں ہو سکتی، مثلاً قیامت کا آنا اور حالات بعد موت اور تخلیق کائنات اسی لیے مذہب سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے قرآن نے سب سے پہلی آیت میں

ایمان بالغیب کی شرط لگادی ہے۔

ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ ۖ
اب انگریزی خوان اور نئے تعلیم یافتہ جو مذہبی تعلیم سے بے بہرہ ہیں۔ مذہبی باتوں میں یہی
اقلیدس کی نئی دلیلیں ڈھونڈتے ہیں اور جب نہیں پاتے تو اصول مذاہب اور عقائد دینی سے ہی
انکار کر دیتے ہیں اور مذہب کی سرے سے ضرورت ہی نہیں سمجھتے ہیں۔

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ۖ

لیکن مذہبی مسائل کے لیے اقلیدس کی سی دلیلوں کے نمونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مذہب
باطل ہے۔ کتنی باتیں ایسی ہیں کہ خود یہ لوگ مانتے ہیں اور ان کی اصل وحقیقت نہیں جانتے۔ مثلاً
روح۔ کون ہے جو روح کے وجود کا قائل نہیں، لیکن کون ہے جو روح کی حقیقت کو سمجھ سکا ہے۔

یا مثلاً مقناطیسی سوئی، اس کا ایک سرا ہمیشہ شمال کی طرف رہتا ہے، لیکن کون بتا سکتا ہے کہ
کیوں رہتا ہے۔ یا مثلاً اجسام مادی میں کشش کا ہونا تو سب تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کا سبب
کوئی نہیں جانتا۔ روح کے ذکر پر میرا ذہن منتقل ہو گیا کہ یہاں مذہب و مذہبی تعلیم کا ایک مفید
نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

یورپ اور امریکہ والے جو ہر نامعلوم چیز کے دریافت کرنے کی سعی کرتے ہیں روح کی
حقیقت معلوم کرنے پر بھی سبالہا سال سے تلے ہوئے ہیں۔ فلسفیوں اور سائنس دانوں نے ہزار
قیاسات، نظریے اور تجربے کیے لیکن روح کا بھید نہ معلوم ہونا تھا نہ ہوا۔ عرس گزاریں اور دولت
بربادی، کتابوں پر کتابیں لکھیں لیکن روح راز کا راز ہی رہی اور اصل یہ ہے کہ قیامت تک تو اس
بھید کا پتہ چل نہیں سکتا۔ اگر یورپ و امریکہ قرآن مجید کی صداقت کے قائل ہوتے تو کم سے کم
حقیقت روح کے لیے سرگرداں رہنے کی زحمت سے تونج جاتے۔ روح کے لیے جیسے اب کر
رہے ہیں۔ لیکن اتنا تو یقین اور وثوق ہو جاتا کہ روح معلوم ہونے والی شے ہی نہیں ہے۔ کیوں؟
اس لئے قرآن مجید کا فیصلہ ہے کہ

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ۚ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنْ

الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ۝

(اللہ تعالیٰ جل شانہ حضور ﷺ سے فرماتا ہے کہ لوگ آپ سے روح کے متعلق سوال کرتے
ہیں۔ ان سے کہہ دیجیے کہ روح میرے پروردگار کا علم ہے اور تم کو تھوڑا سا ہی علم دیا گیا ہے)
اب آپ بتائیے کہ دنیا بھر کے علماء حکماء روح کے متعلق اس قرآنی تشریح سے ایک انج بھی
آگے بڑھے ہیں؟ روح کے امر ہونے سے زیادہ کوئی ایک نکتہ بھی دریافت کر سکے ہیں اور ساتھ
ہی مذہبی تعلیم و ہدایت کے اس پہلو پر بھی غور کیجیے کہ مسلمانوں نے روح کی حقیقت کے پیچھے
پڑنے کی جگہ روح کو ایک حقیقت مان کر روح سے جو کیفیات و آثار مفرغ ہوتے ہیں اور روح پر
جو اعمال و حالات مبنی ہوتے ہیں ان کی تحقیق و جستجو کی اور روح کی لطافت و نورانیت تکلیف و تلوٹوں
موخریت و فعالیت کا احساس و تجربہ کر کے اپنے دل و دماغ، جذبات و احساسات، اعمال و
وظائف حیات میں اصلاح کی اور وہ قوت ایمانی پیدا کی کہ عالم جسم و روح کو مخر کر لیا اور اس قول کو
سچ کر دیا۔

ع..... نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں نقدیریں

حضرات! تمام ہندوستان کی اور خود مسلمانوں کی انفرادی، خانگی اور جماعتی زندگی کا جائزہ
لیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ خود غرضی، خود سری، بے اطمینانی اور بے اعتمادی کا فرما ہیں۔ کسی گھر میں
مشکل سے پُرسکون زندگی نظر آتی ہے اور کسی شہر اور کسی صوبہ میں امن و اعتماد قائم نہیں ہے۔
میرے نزدیک اس کا خاص الخاص سبب مذہبی تعلیم اور مذہبی زندگی کا فقدان ہے۔ مسلمانوں
کے لیے قرآن وحدیث میں، اصحاب کرام اور علمائے عظام کی سیرت میں، اہل اللہ اور بزرگان
دین کے حالات و اقوال میں زندگی کی ہر حالت، ہر شعبے کے لیے نہایت واضح اصول، مفصل
قوانین اور بہترین نمونے موجود ہیں۔ لیکن ان سے بہرہ اندوز ہونا اسی وقت ممکن ہے جب مذہبی
تعلیم عام و لازم ہو جائے اور اس کے نتیجے کے طور پر ہماری زندگی مذہبی زندگی بن جائے۔ جب
کہ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا:

إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

واخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمین
(غیر مطبوعہ)



☆☆☆

- ۱۔ سورہ توبہ آیت نمبر ۱۲۲
- ۲۔ ترجمہ: بلند رتبہ کتاب میں شک کی کوئی جگہ نہیں۔ اس میں ہدایت ہے ڈروالوں کو وہ جو بے دیکھے ایمان لائیں۔ سورہ البقرہ آیت نمبر ۲
- ۳۔ ترجمہ: بلکہ اسے جھٹلایا جس کے علم پر قابو نہ پایا اور ابھی انہوں نے اس کا انجام نہیں دیکھا۔ سورہ یونس آیت نمبر ۳۹
- ۴۔ سورہ بنی اسرائیل آیت نمبر ۸۵
- ۵۔ بے شک میری نماز اور میری قربانیاں اور میرا جینا اور میرا مرنے کا سب اللہ کے لیے ہے۔ سورہ الانعام آیت نمبر ۱۶۲

☆☆☆

اسوۂ حسنہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۖ

[ایک نو مسلم آسٹریں لیو پولڈ ویس (محمد اسدؒ) کے خیالات]

[اس مرد خدا نے انگریزی میں ایک عجیب کتاب لکھی ہے: "اسلام ایٹ دی کراس روڈ" جو تین چار سال ہوئے عرفات پر لیس ماڈل ٹاؤن، لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ جو غلو و فدایت، عمیق مطالعہ اور وسعت نظر، قوت ایمانی و حب رسولؐ اس نئے مسلمان کی تحریر سے نمایاں ہے، ہندوستان کے پشتی مسلمانوں میں کم نظر آتی ہے۔ یہ کتاب ہر مسلمان کو پڑھنی چاہیے۔ اس شیر اسلام کا پیام مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم جو یائے حق مفکروں کے لئے بھی قابل غور ہے۔ (قادری)]

☆☆☆

میں ۱۹۲۲ء میں چند ممتاز اخبارات کا نامہ نگار خصوصی بن کر اپنے وطن آسٹریلیا سے افریقہ، ایشیاء کے سفر کے لئے نکلا تھا۔ اس وقت سے میں نے اپنی عمر کا اکثر و بیشتر حصہ مشرقی ممالک اسلامی میں گزارا ہے۔ مجھے جن قوموں سے ملنے کا اتفاق ہوا ان سے شروع شروع میں اجنبی کی طرح ملتا رہا لیکن جو معاشرت اور معیار زندگی میری نظر کے سامنے آیا وہ یورپ کی افتاد طبع اور افتاد عمل سے بالکل مخالف و متضاد تھا۔ یورپ کی زندگی بالکل مشین کی سی حرکت ہے جس میں تیزی بھی ہے اور شور بھی۔ اس کے مقابلے میں مشرق کی پرسکون بلکہ انسانیت کی زندگی سے مجھے شروع ہی سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ اس ہمدردی نے مجھے شوق دلایا کہ اس باہمی تفاوت کے اسباب دریافت کروں۔ اس طرح مجھے مسلمانوں کی مذہبی تعلیمات سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ یہ دلچسپی اس زمانے میں اس قدر قوی نہ تھی کہ میں اسلام کی آغوش میں آجاتا لیکن یہ بات مجھ پر روشن ہو گئی کہ انسانی سوسائٹی کی تنظیم اس طور پر ممکن ہے کہ اندرونی مخالفتیں کم سے کم ہو جائیں اور اصلی مواخات

اور برادرانہ جذبات زیادہ سے زیادہ پیدا ہو سکیں۔ بہر حال موجودہ اسلامی زندگی، اصلی تعلیم انسانی سے بہت دور نظر آئی۔ اسلام میں جو چیز ترقی اور جدوجہد تھی وہ مسلمانوں میں کابلی اور [سستی] ہے۔ اسلام میں جو شے فیاضی اور قربانی تھی موجودہ مسلمانوں میں اس کی جگہ اب تنگ دلی اور عیش پسندی ہے۔

اس واقعہ کو دریافت کر کے اور قدیم و جدید مسلمانوں کی زندگی میں عدم تناسب سے پریشان ہو کر۔ اس عقدہ مشکل کو حل کرنے کی میں نے یہ ترکیب سوچی کہ اسلامی زندگی کا زیادہ قریب سے مطالعہ کروں، یعنی میں نے یہ فرض کر لیا کہ میں خود دائرۂ اسلام میں داخل ہوں۔ یہ صرف ذہنی و خیالی تجربہ نہیں لیکن اس تدبیر سے تھوڑے ہی عرصہ میں معنی کا صحیح حل میرے ہاتھ آ گیا اور مجھے اس امر کا یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کے جماعتی تنزل اور ذہنی پستی کا ایک اور سبب یہ ہے کہ انھوں نے رفتہ رفتہ اسلامی تعلیم کی روح یعنی روح محمدی کا اتباع چھوڑ دیا ہے۔ اسلام باقی ہے لیکن جسد بے روح ہے۔ وہی عنصر جو کبھی اسلامی دنیا کی قوت کا باعث تھا اب اس کے ضعف کا ذمہ دار ہے۔ یعنی اسلامی جماعت شروع ہی سے دین و ایمان کی بنیادوں پر قائم کی گئی تھی۔ بنیادوں کی کمزوری نے [روح] اسلام کی عمارت کو متزلزل کر دیا ممکن ہے کہ یہ عمارت روئے زمین سے معدوم ہو جائے۔

میں جس قدر غور کرتا تھا کہ اسلامی تعلیمات کیسی مستحکم اور قابل عمل ہیں اسی قدر میری جستجو بڑھتی تھی کہ مسلمانوں نے اپنی زندگی میں ان تعلیمات سے کام لینا کیوں چھوڑ دیا۔ میں نے اس مسئلہ پر تقریباً تمام ممالک اسلامیہ کے مفکرین و مدبرین سے گفتگو کی۔ مجھے اس تحقیقات کا ایسا جنون سا ہو گیا کہ دنیائے اسلام سے میری اور دلچسپیاں اس طوفان میں گم ہو گئیں۔ یہ شوق و شغف آہستہ آہستہ قوی ہوتا رہا یہاں تک کہ میں غیر مسلم ہو کر مسلمانوں سے اس طرح گفتگو کرتا تھا گویا ان کی غفلت اور کابلی سے اسلام کو بچانا اور بری الذمہ ثابت کرنا میرا فرض ہے۔

اس انہماک و وابستگی کا مجھے مطلق احساس نہ تھا یہاں تک کہ ایک دن ۱۹۲۵ء میں میں افغانستان کے پہاڑوں میں ایک نوجوان افغانی گورنر نے مجھ سے کہا: ”لیکن آپ تو مسلمان ہیں صرف اتنی بات ہے کہ آپ کو اس کا احساس نہیں۔“ میں یہ سن کر چونک پڑا۔ لیکن خاموش رہا پھر جب ۱۹۲۶ء میں میں یورپ واپس آیا تو مجھے نظر آیا کہ میرے طرز عمل کا واحد منطقی نتیجہ قبول اسلام کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

یہاں تک میرے مسلمان ہونے کا ذکر تھا اس کے بعد برابر مجھ سے سوال کیا جاتا رہا کہ میں

نے کیوں اسلام قبول کیا؟۔ اسلام کی کس چیز نے مجھے خاص طور پر گرویدہ کیا؟ لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس کا کوئی قابل اطمینان جواب مجھے بھی معلوم نہیں۔ جس چیز نے مجھے متاثر کیا وہ کوئی خاص تعلیم نہ تھی بلکہ اخلاقی ارشاد و ہدایت۔ ملی زندگی کا تمام حیرت ناک اور ناقابل بیان مکمل و جامع نظام تھا۔ میں اب بھی نہیں بتا سکتا کہ اس نظام کا کون سا جز دوسرے اجزاء سے زیادہ مجھے اپیل کرتا ہے۔ اسلام مجھے ایک مکمل تعمیر نظر آتا ہے۔ اس کے تمام اجزاء نہایت تناسب اور موزونیت کے ساتھ باہم پیوستہ اور ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہیں۔ نہ کوئی چیز غیر ضروری ہے نہ کسی شے کی کمی ہے۔ غالباً یہ احساس میرے لیے سب سے زیادہ مؤثر ہوا ہے کہ اسلام کی تعلیمات و اصول میں سے ہر چیز اپنے صحیح مقام پر رکھی گئی ہے۔ ممکن ہے اس کے ساتھ اور مؤثرات بھی ہوں لیکن آج ان کا تجزیہ میرے لیے دشوار ہے۔ بہر حال یہ محبت کا معاملہ تھا اور محبت میں سبھی کچھ ہوتا ہے۔ غرض اسلام میری روح میں اس طرح داخل ہوا جیسے رات کو چور گھر کے اندر داخل ہوتا ہے لیکن چور کے برخلاف اسلام نے اپنا گھر بنالیا اور میرا گھر بنا دیا۔

میں نے قرآن وحدیث کا بغور مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ ایک مسلم کی زندگی کا مقصد اس کی روحانی اور جسمانی ہستی کا مکمل تقابلیق..... وتعاون ہے۔ اسی طرح نبی کریم کی بعثت اور رسالت حیات انسانی کے تمام اخلاقی و عملی انفرادی و اجتماعی اصول و مظاہرات پر حاوی و وسیع ہے؟ سنت کا صحیح مفہوم یہی ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ ۝ وَمَا نَهَاكُمُ عَنْهُ فَانْتَهُوا ۝

(جو کچھ پیغمبر تم کو دیں وہ لے لو اور جس کی ممانعت کریں اس سے باز رہو) حضور سرور کائنات نے جب ارشاد فرمایا کہ میری امت کے بہتر (۷۳) فرقے ہو جائیں گے اور وہ سب دوزخی ہوں گے، بجز ایک کے۔ تو صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا کہ وہ ایک فرقہ کون سا ہو گا۔ حضور نے ارشاد فرمایا:

مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي۔ یعنی جو میرا اور میرے اصحاب کا اتباع کریں گے۔ اتباع سنت کے مسئلہ کو قرآن مجید نے تو ایسا صاف واضح کر دیا ہے کہ شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُخَرِّجُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيْٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝

(ترجمہ: نہیں تمہارے رب کی قسم وہ مومن نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے تنازعات میں تم کو منصف نہ بنائیں اور تمہارے فیصلے سے اپنے دلوں میں کوئی ناگواری محسوس نہ کریں اور اس کو پورے طور پر تسلیم نہ کر لیں)

دوسری جگہ اور ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ
وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ۝

(ترجمہ: اے پیغمبر کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ اور اللہ غفور و رحیم ہے۔ کہہ دو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو لیکن اگر بر گشتگی اختیار کرو گے تو بے شک اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔)

مترجم حامد حسن قادری 'آگرہ ۱۲/۱۲/۱۳۸۷ء

(غیر مطبوعہ)

☆☆☆

(۱) سورۃ الاحزاب - آیت نمبر ۲۱

(۲) معروف مشرق 'مصنف' عالم دین اور مبلغ علامہ محمد اسد (لیو پولڈ ویس) ۱۹۰۰ء میں پولینڈ کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے۔ پیشے کے اعتبار سے صحافی تھے۔ پیشہ وارانہ مصروفیات کے باعث اسلامی ممالک میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ چھ برس مدینہ منورہ اور سعودی عرب کے دوسرے شہروں میں مقیم رہے۔ انھیں سلطان ابن سعود کا خصوصی قرب حاصل رہا۔ برصغیر میں علامہ محمد اقبال کے قریب رہنے کا موقع ملا۔ کچھ عرصہ پٹھان کوٹ کے مقام پر مولانا مودودی کے ساتھ رہے۔ ۱۹۲۶ء میں اسلام قبول کیا۔ پاکستان میں حکومت کی زیر سرپرستی چلنے والے ایک جدید محکمے اسلامی تعمیر جدید کی تنظیم و نگرانی پر مامور ہوئے۔ بعد ازاں محکمہ خارجہ کے شعبہ مشرق وسطیٰ کے افسر اعلیٰ رہے۔ اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد میں شامل رہے۔ بعد میں مراکش چلے گئے۔ "اسلام ایٹ دی کراس روڈ" اور "اے روڈ ٹو ٹوکمہ" ان کی معروف تصانیف ہیں۔ قرآن پاک کا ترجمہ کیا اور حواشی لکھے۔ صحیح بخاری کے کئی حصوں کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا۔ مارچ ۱۹۹۲ء میں پٹین میں وفات پائی۔

(۳) سورۃ الحشر - آیت نمبر ۷

(۴) سورۃ النساء - آیت نمبر ۶۵

(۵) سورۃ ال عمران - آیت نمبر ۳۱

☆☆☆

[پردہ ایک] تعارف

پردہ نشینی اور اعلیٰ تعلیم قدیم تہذیب اور جدید افسانہ نگاری گھر کی چار دیواری اور ادبی شہرت کم یا ب سہی محال نہیں ہے۔

ایک ظریف دوست نے ایک مرتبہ کہا کہ یہ جو عربی کا مشہور مقولہ ہے:

أَلْعِلْمُ حِجَابٌ أَكْبَرُ - علم سب سے بڑا حجاب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم خود پردہ نشینی کے مترادف ہے۔ علم حاصل کرنا گویا پردے میں بیٹھنا ہے۔ عورتیں جتنی اعلیٰ تعلیم حاصل کریں گی۔ پردہ و حجاب کی اصل خوبیاں خود بخود ان میں پیدا ہو جائیں گی۔

میں نے کہا آپ نے عربی کے قائل کا مفہوم تو بالکل توڑ موڑ کر رکھ دیا۔ کہنے والا کیا کہنا چاہتا تھا آپ نے کیا معنی پہنا دیے۔ مگر اپنی ذہانت و ظرافت سے بات دلچسپ پیدا کر دی۔

بات تو یہ ہے جو ہمارے ظریف دوست نے کہی لیکن اگلے زمانے والے بڑے بدگمان لوگ تھے۔ اس لیے انھوں نے زندگی کا ایک معیار مقرر کر رکھا تھا جو کچھ اس قسم کا تھا:

سہل نبود در محیط دہر پاس اعتبار

آبروئے چوں گہر ہمراہ سر داریم ما

(بیدل)

ان کا خیال تھا:

زدست انداز دشمن نیست غم خلوت گزیناں را

کہ بیم آستین نبود چراغ زیر داماں را

(غنی)

وہ سمجھتے تھے کہ بے پردگی کی تعلیم سے کم از کم پریشاں خیالی ضرور پیدا ہوئی ہے۔ اور دل کا مطمئن اور یکسو رہنا بڑی نعمت اور علم و تعلیم کا حاصل ہے:

ما بیک صفحہ ز صد نسخہ فراغت داریم

دل آشفته اگر جمع شود دفتر ما ست

دل اگر مطمئن ہو تو انقلابات و حوادث کے اثر سے محفوظ رہتا ہے۔

حوادث مژدہ امن است اگر دل جمع شود بیدل
گہر افسانہ داند شورش امواج جیہوں را
امن وعافیت کے لئے آنکھیں بند رکھنا ضروری ہے:

گوشہ اسنے ز چشم بستہ دارم چوں حباب
گر نظر وای کنم بر خویش سیلاب من است

(بیدل)

اگلے وقتوں کے ان لوگوں کی رائے تھی کہ نگاہوں کو اگر جلوہ کا سودا ہوگا تو ہوش و خرد کو خیر باد کہنا
پڑے گا۔

فی سآزد متاع ہوش با یوسف خریداراں
ز نقد خود رفتن نگاہ جلوہ سودا را

(بیدل)

اس لئے وہ لوگ اس حیا کے قائل تھے۔

نہ چہرہ اش عرق از گرمی ہوا کرد دست
نگاہ را رخ او آب از حیا کرد دست

(صائب)

بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ

گر بسوزد آہ مجنوں بر رخ لیلی نقاب
شرم می بالد بان خود چندانکہ محمل می شود

(بیدل)

لیکن زمانہ بدل جاتا ہے پرانی قدروں کی قدر نہیں رہتی۔ نہ صرف قدریں بدل جاتی ہیں بلکہ
قدروں کی قدر بھی بدل جاتی ہے اور دنیا اس کی قائل ہو جاتی ہے کہ بدی فی نفسہ بدی نہیں۔

ضرر و نفع جہاں است بہ نسبت ورنہ
زہر در عالم خود صاحب تریاک است

(بیدل)

پھر ساری رکاوٹیں سامنے سے ہٹا دی جاتی ہیں۔

چہ دنیا و چہ عقی سید راہ اوست اے غافل
بیا بگذر کہ از بہر گذشتن ہاست حایل را

(بیدل)

اور طلسم قدیم کو توڑ دیا جاتا ہے۔

زندگی در بند و قید رسم و عادت مردن است
دست دست تست بشکن این طلسم بنگ را

(بیدل)

پھر کہاں کی دور بینی
مگر از فکر عقی باز گرم تا بخویش آیم
کہ از خود سخت دور افتادہ ام از دور بینی ہا

(بیدل)

اور کیسی صبر آزمائی
کسے یا رب مبادا فرودہ نیرنگ خودداری
شرارم سنگ شد از کلفت صبر آزمائی ہا

(بیدل)

پھر زندگی کا یہ معیار ہو جانا یقینی ہے۔

نشاط این جا بہار این جا بہشت این جا نگار این جا
تو خود گر عاقلی صرف عدم کن دور بینی ہا

(بیدل)

اور از خود فکری اس کا لازم نتیجہ ہے۔

جلوہ مشتاق بہشت و دوزخی در کار نیست
می روم در خویش در ہر جا کہ می خوانی مرا

(بیدل)

لہذا یہ آرزو پیانا ہونا بدیہی ہے:

می روم از خویش در اندیشہ باز آمدن
ہچو عمر رفتہ یارب بر مگردانی مرا

(بیدل)

اور دلیل یہ حاضر ہے کہ وہ کون تھا جو خرابات میں خراب نہ تھا۔
تامل گر کئی ہر کس برنگے رفتہ است از خود
طش ہائے کہ دارد بحر گوہر ہم ہماں دارد

(بیدل)

پھر ضبط و خودداری کے قائل نہیں رہتے اور کہتے ہیں:

جزو ہا در عقدہ خودداری از خود غافل اند
نقطہ از ضبط عنان گر بگردد دفتر شود

(بیدل)

اور اس بات کو نہیں سوچتے:

راحت جاوید در ضبط عنان آرزو ست
بال و پر چون جمع گردد آشیانہ می شود
اور وقار بھی اسی استقلال میں ہے:

سنگ اسود نہ تلا کعبے سے
پتھر اپنی ہی جگہ بھاری ہے

(داغ)

پھر اگر یہ اندیشہ پیدا ہو جائے تو کیا تعجب:

گداز سینہ طوفان کرد دست از ما بشو بیدل
نبرد ایں سیل اگر امروز فردا می برد مارا

(بیدل)

ترک تمکین است بیدل خواری اہل نظر
اشک را از بیقراری خاک بر سر می شود

(بیدل)

اور یہ کیفیت ہو جائے تو کیا بعید:

در بیابانے کہ شور ہے خودی رہبر شود
راہ صد مطلب بیک اغزیں پا سر شود

(بیدل)

اور یہ مجبوری پیش آجائے تو کیا چارہ
بجز سستی فکستن ساحل امنے نمی باشد
کہ از وسعت فرو برد دست ایں دریا کراں ہا را

(بیدل)

لیکن اس میں استثنائی ہستیاں بھی ہیں۔

مبصران حقیقت کہ سر بسر ہوش اند
برنگ شیشہ آئینہ فارغ از جوش اند

(بیدل)

ایسی ہستیاں آدمی کو بجائے خود مٹھرا خیال سمجھتی ہیں۔

گر بخود سازد کسی سیر و سفر درکار نیست
ایں کہ ہر سوی رویم از خویش رم داریم ما

(بیدل)

ان کے دل آسودہ میں شعور کائنات بھی آکر سکون پاتا ہے۔

دل آسودہ ما شور امکان در قفس دارد
گہر دزدیدہ است ایں جا عنان موج دریا را

(بیدل)

لیکن ایسی ہستی ہنگامہ حیات سے آنکھیں بند کئے نہیں رہتی بلکہ کھلی آنکھوں سے صحیفہ کائنات کا مطالعہ کرتی ہے:

نش جہت آئینہ دار شوخی اظہار دوست
نیست جز مژگاں حجابے را کہ برداریم ما

(بیدل)

یہ ہستی تصویر خانہ کائنات سے بے نیاز رہنے کو جائز نہیں رکھتی:

غافل از ظاہر آفاق نباید بودن
آخر اے بے خبر ایں بزم طلسم صورت

(بیدل)

بلکہ ہمہ تن محو جلوہ ہونے کو کمال سمجھتی ہے:

تو و صد چمن طرب نمو ، من و شبنم گنگہ آبرو
بہ بہار عالم رنگ و بو ، ہمہ جلوہ تو ہمہ دیدہ من

(بیدل)

دنیا کی ایسی ہستی کے لئے علم عرفان افسردہ دلی کا سبب نہیں بن جاتا
آگاہی و افسردگی دل پہ خیال ست
تا دانہ بخود چشم کشود ست نہال ست

(بیدل)

بلکہ سعی و عمل کا پیغام ہوتا ہے اور عمل سے ایک لمحہ فرصت نہیں ملتی:
الوداع اے نغمہ فرصت کہ افسون عمل
عشرت امروز ما بنیاد با فردا گذاشت

(بیدل)

ایسی ہستی کی نظر میں عرفان نفس، مشاہدہ کائنات اور ذوق عمل کا تقاضا ہوتا ہے کہ اپنی
انفرادیت کو قائم رکھا جائے۔ آفاق میں خود کو گم نہ کر دیا جائے۔

سکھ بے تاب مرا یا رب چہ پیوندے بہ بحر
ترسم ایں جزو طہیدن مایہ گوہر شود

(بیدل)

اور یہ آرزو رہتی ہے:
تا دہد ہر ذرہ من عرض حسرت نامہ
ایں کف جا کے کہ دارم کاش مشیت پر شود

(بیدل)

یہ ہستی اپنے ذوق عمل کے لئے بے شمار راہیں اپنے سامنے دیکھتی ہے:
غیر دیر و کعبہ ہم صد جا تمنا می کشد
زندگی یک جامہ است و ایں ہمہ احرام با

(بیدل)

اس کا اصل الاصول یہ ہوتا ہے کہ انسان معطل نہ رہے:
ع..... اے ز فرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

(بیدل)

جہد تعلیل صفت نقص کمال ذات تست
یا بگو یا بشنو گفت و شنید است ایں جا

(بیدل)

یہ گفت و شنید تصنیف و تالیف کی صورت میں بھی عمل میں آتی ہے۔ لیکن اس کے لئے بلند نگاہی
شرط ہے:

چہ خوش است اگر بود آں قدر ہوس بلندی منظر
کہ براں مکاں چو قدم نہی کم گردشی نخورد سرت
اور وسعت مشرب:

تمیز تو شد دور باش حقیقت
کہ حق دیدی و غیر باطل ندیدی
حساب تو با کبریا راست ناید
زمین را بگردوں مقابل ندیدی

(بیدل)

اور ہمدردی عام کہ — سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے:
بلکہ ما حسرت نصیباں وارث بیتابی ایم
می رسد بر ما طہیدن ہر کہ بسکلی می شود

(بیدل)

دو جہاں ساغر تکلیف ز خود رفتن ماست
دل ہر کس بطہد قافیہ تنگ است ایں جا

(بیدل)

جس میں کوتاہی باعث ندامت و خجالت ہو:
بلکہ جاں سختی ما آئینہ خجالت بود
ہر کہ شد آب ز درد تو گذشت از سرما

(بیدل)

ایسی خجالت:
اشک شمعیم کہ از خجالت اظہار نیاز
با عرق می چکد از جہد خود گوہر ما

(بیدل)

اس لئے کہ یہی دل سوزی باعث آبرو مندی و سر بلندی ہے:

چوں شمع سر بلندی عشاق مفت نیست
یعنی بقدر سوختن است آبروئے ما

(بیدل)

ایسی آفاقی ہستی کی ہمت کا بھی یہ عالم ہوتا ہے:

بیدل از ہمت مخمور بے عشق پیرس
بہ کہ از دور جہاں پر نشود ساغر ما

(بیدل)

اور اسی لئے شان یہ ہے:

خاکے چو موج بحر ندارد جبین شان
قوے کہ از گداز دل خود وضو کنند

(بیدل)

ایسی ہستی کی ہر گفت و شنید یا تحریر و تقریر یا تصنیف و تالیف فکر و تامل کی حامل ہوتی ہے:

در مقامے کہ بود جلوہ گہ شوخی فکر
جوہر از موج سرشک آئینہ زانو را

(بیدل)

اور اس کا یہ نتیجہ:

بیدل از فیض تامل در گلستان جہاں
بوئے معنی غنچہ اندیشہ پیدا می کند

(بیدل)

لیکن گفت و شنید سے بند نہیں رہتا:

فردگی ہائے ساز امکاں ، ترانہ ام راعناں نگیرد
حدیث طوفاں نوائے عشقم ، خموشی از من زباں نگیرد

(بیدل)

اور ساری کائنات اس کے نغمہ یا نالہ میں لپٹ جاتی ہے:

نالہ من صفت شور قیامت دارد
کہ بساط دو جہاں را بہ صدای پیچد

(بیدل)

اور ساری دنیا اس نالے کو لے اڑتی ہے اور اس کی صدائے بازگشت بن جاتی ہے:

حسرت دل ایں قدر ہا شور بالیدن نداشت
ما ہماں یک نالہ ایم ، اتنا جہاں کہسار بود

(بیدل)

اگر اس ہستی کا خود یہ عالم ہو:

نگاہ ما ز تماشای غیر مستغنی است
بروں ز خویش چراغ گہر نمی تابد

(بیدل)

ایسی ہستیوں میں ایک ہستی عابدہ ہیں۔

عابدہ کے لئے میرا پیام یہ ہے:

بیدل از سادہ دلی آئینہ لبریز صفاست
آب ایں چشمہ ز موج نظر پاک خودست

(بیدل)

(غیر مطبوعہ)

☆☆

ہے، یہ فطرۃ اللہ ہے۔ اب آگے بڑھیے، عورت کو شوہر تو بجز مرد کے کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا نہ دکھائی دے سکتا ہے۔ اس کی نظر میں شوہر اور مرد ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں اسی لیے محاورے میں مترادف ہو گئے ہیں۔

اس سے آگے اصل مسئلہ ہے جو آپ کا مابہ الجھٹ اور میرا فیدہ انظر ہے۔ ہر عورت ہر نامحرم مرد کو مرد ہی دیکھتی ہے، مرد ہی سمجھتی ہے، دیکھتی ہے تو مرد سمجھ کر اور نہیں دیکھتی تو مرد جان کر۔ پردہ کرتی ہے تو مرد سے اور پردہ اٹھاتی ہے تو مرد سے۔ آپ کو آجکل کوئی مرد دکھائی نہیں دیتا لیکن مردوں کو آجکل عورتیں بہت دکھائی دیتی ہیں۔ پہلے زمانہ میں صرف ایک طبقے کی عورت، صرف عورت اور عورت ہی نظر آتی تھی دوسری طبقے کی عورت یا برقع میں چلتا پھرتا بستر یا پردہ وار ڈولی میں متحرک گھڑی یا بند شکر میں دوڑتی ہوئی گاڑی نظر آتی تھی لیکن عورت اب ماں کے پردہ شکم سے نکلنے کے بعد اپنے جلوۂ نساہت کے لیے اور کسی پردے کو حائل کرنا نہیں چاہتی۔ کھلا چہرہ کھلے بازو آدھا کھلا سینہ، آدھی کھلی ٹانگیں، عورت کی نظر میں نساہت کی نمائش کے لیے کافی نہیں ہیں بلکہ جسم کی چند بالشت جگہ جو بیہوش کو رنگینیوں میں ڈبو رہی ہے اس کے آب و رنگ سے بھی چشم نظار کو سرشار کرنا چاہتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی یورپ و امریکہ کی بعض بہنوں نے اس تکلف کو برطرف کر دیا ہے:

وا کر دیے ہیں شوق نے بند نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

(غالب)

آپ عورت اور مرد دونوں کی فطرت کو پیش نظر رکھیے۔ ہر انسان مرد ہو یا عورت اپنے آپ کو حسین سمجھتا ہے اور زینت و آرائش سے اپنے حسن کو چار چاند لگانا چاہتا ہے۔ اس احساس و خواہش سے عورت، مرد کا کوئی فرد مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہر مرد اور ہر عورت کی نظر میں اس کا غیر جنس حسین یا دلکش ہوتا ہے۔ یہ دونوں باتیں انسان کی فطرت ہیں اور حکیم مطلق جل شانہ کے دو زبردست قانون قدرت۔ اب ان اصولوں کے ساتھ اس باریک نکتہ پر غور کیجیے کہ ہر عورت اپنے حسن و زینت کے احساس و خواہش کے ساتھ یہ بھی علم و احساس رکھتی ہے کہ مرد اس کے حسن و زینت کو پسند کرتا ہے۔ یہ احساس نیم شعوری حالت میں ہر عورت کی فطرت میں پنہاں ہے۔ اس سے کوئی عورت کنواری، بیانی، پردہ نشین، شریف زادی، پارسا، پرہیزگار خانی نہیں ہے۔ ممکن ہے آئینہ دیکھتے وقت، کنگھی کرتے وقت کوئی خاص موقع اور خاص مرد عورت کے ذہن

آئینہ حرم

(آپ پردہ مردوں سے کریں!)

(بجواب مضمون محترمہ اصغری بیگم صاحبہ مطبوعہ اخبار بدیعہ سکندری مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۳۹ء)

اس لیے کہ عورت ہر حالت میں عورت ہے، اور مرد ہر حیثیت میں مرد ہے۔ اس لیے کہ آپ کے الفاظ میں مرد اگر بزدل ہے تو مرد ہے، غلام ہے تو مرد ہے، بیکار ہے تو مرد ہے۔ بے حمیت ہے تو مرد ہے۔ ظالم ہے تو مرد ہے۔ تنگ دل ہے تو مرد ہے، کم حوصلہ ہے تو مرد ہے، اکڑ باز خاں ہے تو مرد ہے۔ ان صفات کے مردوں کو آپ چاہے انسان نہ کہیے اور میں بھی آپ کی تائید کرتا ہوں لیکن جس صفت کے سبب سے پردہ کرنے کی ضرورت ہے وہ ان سب میں موجود ہے۔ آپ کہتی ہیں کہ ”پردہ مردوں سے ہوتا ہے، ہم کس سے پردہ کریں آج کل تو ہمیں کوئی مرد دکھائی نہیں دیتا۔“ معلوم نہیں آپ نے کس نظر سے دیکھا تھا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود میں کو دوسرا نظر نہیں آتا، خود سر کو کچھ کا کچھ نظر آتا ہے اور بے خود کو کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ یقیناً آپ نے نساہت کی عینک سے مردوں کو نہیں دیکھا یا جوش مخالفت کی گھبراہٹ میں دور بینی کا چہرہ نکھوں سے گر پڑا تھا۔

یاد رکھیے کہ کوئی عورت کسی مرد کے مرد ہونے کو نظر انداز نہیں کر سکتی اور نہیں بھول سکتی۔ ہر عورت کو ہر مرد مرد ہی نظر آتا ہے۔ کوئی عورت اپنے باپ، بھائی، اور بیٹے کو بھی بجز مرد کے کچھ نہیں دیکھتی۔ اس کے دل میں ان ہستیوں کے ساتھ جو جذبات احترام و شفقت و محبت ہوتے ہیں وہ ان کے مرد ہونے کے سبب سے ہوتے ہیں اور یک گونہ مختلف ہوتے ہیں ان جذبات سے جو ماں، بہن اور بیٹی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ میں تو مرد ہوں اور اپنے تصور اور تجربہ و مشاہدہ سے کام لے رہا ہوں، آپ عورت ہیں آپ کا دل میرا شاہد ہوگا کہ عورت کو باپ بھائی اور بیٹے سے بھی ایک خاص دلچسپی، ایک لطیف تعلق، ایک عجیب کشش ان کے مرد ہونے سے ہوتی ہے۔ یہ عورت کی فطرت

میں ہو، ممکن ہے وہ اس وقت اپنے جمال و زینت کو نہ دیکھ رہی ہو بلکہ بے خیالی میں عادت کے طور پر کنگھی چوٹی کر رہی ہو لیکن اس وقت بھی یہ احساس کہ اس کا حسن و زینت مرد کے لیے نظر فریب و دلکش ہے، عورت کے ذہن اس کے نفس اس کی روح میں موجود ہوتا ہے اور ذرا سی تحریک، ایک نظر، ایک اشارے، ایک خیال، ایک تصور سے وہ خفتہ احساس بیدار ہو سکتا ہے۔ یہ علم و احساس فطری ہے اس لیے مذموم نہیں لیکن فطری و دلچسپ بھی کبھی ادنیٰ سی لغزش سے خطرناک بن جاتی ہیں۔

اس کے برخلاف مرد اپنی زینت و آرائش کے وقت بجز خاص موقع و ضرورت کے، عورت کا تصور اور اس کی پسندیدگی کا خیال ذہن میں نہیں رکھتا اور نہ یہ بات عورت کی طرح مرد کی فطرت میں داخل ہے اس لیے کہ مرد اور عورت دونوں اس حقیقت سے واقف ہیں کہ عورت کی نظر میں مرد کا مرد ہونا زیادہ دل فریب ہے۔ تاریخ عالم کے واقعات اس حقیقت کے گواہ ہیں۔

ایک اور امتیاز اور وجہ کشش مرد کی فعالیت اور عورت کا انفعال ہے۔ مرد کی کارفرمائی سے متاثر ہونا، مرد کی قوامیت کو تسلیم کرنا، بلکہ مرد کی قوت میں پناہ لینا، عورت کی خلقت و فطرت میں داخل ہے۔ اب سے پانچ ہزار برس پہلے کی وحشی عورت اور اب سے سو برس پہلے کی پردہ نشین اور قدامت پرست عورت اور آج کی بے پردہ آزاد خیال عورت، سب اس فطری نسائیت میں برابر ہیں۔ مرد اپنی جنسی فعالیت و قوامیت کے سبب سے اپنے آپ کو عورت کی حفاظت، نگرانی، تربیت، رہنمائی، اعانت کا ذمہ دار سمجھتا ہے اسی طرح عورت اپنے خلقی انفعال و اثر پذیری کی وجہ سے اپنے جوہر نسائیت کی نمود، ترقی اور تکمیل کے لیے مرد کی دست نگر ہونے اور اعتماد رکھنے پر مجبور ہے۔ یہ بھی باہمی جذب و کشش کے اسباب ہیں۔ اسی انفعال کا ثبوت کہیے یا اثر، عورت کا ناقص العقل ہونا ہے۔ اس لفظ سے عورت بہت چڑنی ہے اور مرد کی زبان سے اپنے آپ کو ناقص العقل سننے کو بڑی توہین سمجھتی ہے۔ اس کے متعلق ایک لطیفہ یہ ہے کہ چند مہینے ہوئے ایک زمانہ رسالہ کی کسی مضمون نگار بی بی نے اپنی جنس کو ناقص العقل لکھ دیا تھا اس کو پڑھ کر عورتیں تو بعد کو برا مانیتیں پہلے رسالہ کے مرد اڈیٹر کی کو سخت ناگوار ہوا اور انہوں نے اسی پرچے میں اس کی مخالفت میں طویل مضمون لکھ دیا اور اس میں لکھا کہ عورتوں کو ناقص العقل کہنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ پاگل خانوں میں عورتوں سے زیادہ مرد ہیں اور سلطانہ رضیہ کیسی غفلت تھی کہ بادشاہ ہو گئی اس کا بھائی التمش احق ثابت ہوا۔ میں نے ان اڈیٹر صاحب کو لکھا کہ اڈیٹر ہونے کے باوجود آپ سے ایسی غلطی کا ہونا نہایت تعجب کی بات ہے۔ آپ نے ناقص العقل کے معنوں پر غور نہیں کیا۔ ورنہ پاگل

خانوں کی مثال نہ دیتے۔ نقصان زیادت و کمال کا متضاد ہے ”ضرر“ کا نہیں ”ناقص العقل“ کے معنی کم عقل کے ہیں، ”بے عقل“ کے نہیں۔ عقل کی کمی کمال عقل کے مقابلے میں بولی جاتی ہے۔ عورتوں کو کم عقل کہتے ہیں۔ مسلوب الفضل یا مختل المواس یا پاگل نہیں کہتے۔ اس لیے عقل کی کمی مرتبہ کی کمی ہے توہین نہیں ہے۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ بہر حال عورت کی عقل کا فرمائی کے لیے تنہا کافی نہیں ہے۔ دنیا کی اتنی عمر ہو گئی اس کو ہر قسم کا تجربہ ہے۔ یہ بھی آپ کی ہم جنس کہلاتی ہے اس سے پوچھ دیکھیے کہ تو نے ہم کو مردوں پر تفوق کیوں نہ دیا۔ ہم کو ہی ہمیشہ بادشاہ، وزیر، سپہ سالار، قانون ساز، قاضی، مفتی، محتسب، لیڈر، امام، تاجر، سیاح کیوں نہ بنایا، مردوں کی ہی دست نگر کیوں رہی؟ ”مادر گیتی“ یہ جواب دے گی کہ میری نظر میں میری بیٹیاں بیٹوں سے کم چہیتی اور لاڈلی نہ تھیں۔ میں نے بیٹیوں کو وہ درجہ دیا جو ان کے اور انھیں کے لائق تھا۔ میں نے ان کو پہلے بیوی بنایا پھر بیٹی بنایا پھر بہن بنایا، پھر ماں بنایا۔ میری بیٹیوں نے بیوی بن کر وفاداری کی، بیٹی بن کر خدمت کی، بہن بن کر ہمدردی کی، ماں بن کر شفقت کی۔ انھی ماؤں کے پیٹ سے نکلے ہوئے اور گود کے پلے ہوئے میری خدمت کرتے ہیں اور مجھے سنبھالے ہوئے ہیں۔ مرد جو نام آور بادشاہ اور صاحب سیف و قلم ہوئے ہیں یہ آپ ہی نہیں ہو گئے۔ میری بیٹیوں اور ان کی ماؤں نے ان کو بنایا ہے یہ لوگ جس دن اس احسان کو بھول جائیں گے میں خود ان کو عاق کر دوں گی۔

یہ فقرے پھر تمثیلی رنگ میں قلم سے نکل گئے اور میں اپنے موضوع سے ذرا سا ہٹ گیا۔ عورتوں کی آزادی، پردہ پراندازی اور ہوا خوری کے سلسلہ میں عورت کی فطرت کے ایک پہلو کو میں اور یاد دلانا چاہتا ہوں۔ ہر قسم کے عیب و گناہ میں عورت و مرد برابر ہیں۔ ہر سزا دونوں کے لیے قانون ملک و مذہب میں یکساں ہے۔ ہر اخلاقی و عملی لغزش کا اثر دونوں کے قلب و روح اور اعمال حیات پر ضرور پڑتا ہے لیکن ایک لغزش ایسی ہے کہ لڑکھڑانے کے بعد تو عورت مرد دونوں سنبھال سکتے ہیں لیکن گرنے کے بعد مرد اٹھ کر کھڑا ہو سکتا ہے عورت نہیں اٹھ سکتی۔ وہ مرد جو اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے شرع کے نزدیک معتب و مغضوب ہے۔ سوسائٹی کی نظر میں مطعون و ملعون ہے اور جو سوسائٹی اس کو ایسا نہیں سمجھتی وہ خود قابل لعنت اور لائق غضب ہے لیکن اس کو کیا کیجیے کہ مرد کی خلقت ایسی ہے کہ بظاہر اس کا کچھ نہیں بگڑتا اور عورت کی خلقت ایسی ہے کہ اس کا بہت کچھ بگڑ جاتا ہے۔ مرد کی فطرت ایسی ہے کہ ارادی و اختیاری لغزش کا بھی اثر اس پر دائم و قائم نہیں رہتا اور عورت کی فطرت ایسی ہے کہ ارادی و اختیاری لغزش کا اثر اس پر سے کبھی زائل نہیں ہوتا اس لیے

عورت زیادہ نقصان میں رہتی ہے۔

اس مسئلہ کا اعمال پر اثر دیکھنے کے ساتھ اس افسوس ناک واقعہ کو بھی پیش نظر رکھنا پڑے گا کہ ایسی ٹھوکھا کر کرنے والے مرد عورت دونوں کو ہمارے ملک کے قانون نے لائق سزا نہیں گردانا۔ شرع اسلام نے عورت مرد دونوں کو ایک پلے میں رکھا ہے، یکساں احکام مقرر کر دیے ہیں، ہاں برابر فرق نہیں رکھا اور ایسے کھلے اور صاف قانون بنا دیے ہیں جن میں ذرہ بھر شبہ باقی نہیں رہا لیکن قانون ملک نے رضا و اختیار کو مستثنیٰ رکھا ہے اس لیے مرد عورت دونوں دلیرو بے خوف ہیں اور عورت کے نقصان کی تلافی اور بھی دشوار ہو گئی ہے۔

ان حقائق فطرت، اصول، قدرت اور قوانین عمل کی روشنی میں عورتوں کی آزادی و بے پردگی کو دیکھنا چاہیے۔ عورتوں کو مردوں سے شکایت ہے کہ:

”ہر وقت جنس لطیف پر قوت آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ اپنی عورتوں کو قید میں رکھ کر تازہ ہوا سے محروم کر دیتے ہیں اور خود آزاد رہ کر پرائی بہو بیٹیوں پر بڑی نظر ڈالتے ہیں۔ بیوی کی ذرا سی خطا پر ہاتھ اٹھاتے ہیں کمانے کھانے کے معاوضہ میں ان سے خدمت لیتے ہیں اور درجنوں بچے پیدا کرتے ہیں۔ عورت کو لونڈی، پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں۔ ذرا پیسہ ہوائیں کٹی کٹی شادیاں کر لیتے ہیں اور درحقیقت دل میں ایک کو بھی جگہ نہیں دیتے اور جو آزاد خیال ہوئے تو بیوی کو نیم عریانی کی حالت میں دوستوں کے ساتھ ڈانس کراتے ہیں اور خود بدلہ میں ان کی بیویوں کے ساتھ ناچتے ہیں اور غیرت و حمیت پاس تک نہیں پہنچتی۔“ (اقتباس مضمون)

یہ سب شکایتیں مجز تازہ ہوا سے محروم رہنے کے، حق بجانب ہیں اور میں ایسے مردوں پر ملامت کا ووٹ کرانے کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہوں۔ تازا ہوا کی تائید اس لیے نہیں کرتا کہ ہوا لگ جاتی ہے۔ ایک اور شکایت بھی تائید سے قابل استثناء ہے کہ کمانے کھانے کے معاوضہ میں خدمت لینا، لیکن..... واضح نہ تھا۔ کمانے کھانے کا احسان جتنا اور طاقیت سے زیادہ کام لینا پیٹنگ لائق نفیس ہے۔ ویسے شوہر کی خدمت کرنا بیوی کا فریضہ زندگی ہے لیکن اگر اس کے اسناد کے لیے پردہ اٹھانے کا رزلوشن پیش ہوا تو میں پُر زور مخالفت کے لیے کھڑا ہو جاؤں گا اور پردہ کے بعد کا لائحہ عمل (پروگرام) دریافت کروں گا یہ تحریک پیش کی جائے کہ

”اُن سے پردہ کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ طاقتور بننے کی ضرورت ہے، جس طرح شیر، چیتے، سانپ، بچھو سے پردہ نہیں کیا جاتا بلکہ طاقت سے کام لیا جاتا ہے۔“

(مضمون مذکورہ کا آخری فقرہ)

اور اگر اس کے بعد تقریر کو ختم کر دیا جائے گا تو میں ”پوائنٹ آف آرڈر“ پکاروں گا۔ اور اس کی توضیح طلب کروں گا کہ پردہ سے باہر نکل کر کس طرح طاقتور بنا جائے گا اور طاقت سے اسناد شکایات کے لیے کیا عمل کیا جائے گا۔

کیا عورت طاقتور بننا چاہتی ہے۔ بے پردہ ہو کر حسن و زینت کے اسلحہ لگا کر (جس کو انگریزی میں ”وار پینٹ“ کہتے ہیں) مردوں کے ساتھ یونیورسٹیوں میں تعلیم پا کر مردوں کے ساتھ سینما ہال، ڈنر میں شریک ہو کر، ٹینس کی چیمپین بن کر، ورزش اور تیراکی کا ریکارڈ توڑ کر، لیڈز کانفرنس میں مردوں پر نفیس و ملامت کر کے، نکاح کی مخالفت کر کے، مانع حمل تدابیر اختیار کر کے، عورت یہ سب کچھ کر سکتی ہے اور کر رہی ہے لیکن نہیں کر سکتی تو اپنی فطرت کی مخالفت، اور نہیں کر رہی تو اپنی عصمت کی حفاظت۔ جن شیروں اور سانپوں کو وہ بے پردہ ہو کر اور طاقت سے کام لے کر ہلاک کرنے کے درپے ہے، ان کو قدرت ہی نے چھوڑ رکھا ہے۔ اور یہ سانپ عورت کے سینے پر لوٹنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ کوئی خود سر بیگم اور خود آرا خانم دور سے کتنا ہی غراتی رہے لیکن جب یہ شیر دیو بوجھ لیتا ہے تو بھیگی بلی ہی بننا پڑتا ہے اور مزہ یہ ہے کہ پارک کے گوشہ اور ہوٹل کے کمرے سے نکل کر عورت پھر اخباروں اور کانفرنسوں میں مردوں پر لعن و طعن کے پھول برسانا شروع کر دیتی ہے:

بدم حفتی و خورسندم ، عفاک اللہ کو سحفتی

جواب تلخ می زبید لب لعل شکر خارا

(خواجہ حافظ)

یورپ اور امریکہ میں یہ روزمرہ کے واقعات ہیں اور اب دلیری بڑھ گئی ہے کہ علانیہ مردوں کا یہی مصروف رہ گیا ہے۔ آلہ کار سے زیادہ ان کو کوئی درجہ دینے کو تیار نہیں ہے۔ ڈھٹائی اور بے حیائی کے ساتھ اس کو صحیح طریق عمل کہا جاتا ہے:

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی

بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو پھر کہو کہ ہاں کیوں ہو

(مرزا غالب)

ہندوستانی اور مسلمان عورتیں بھی ان بہنوں کی تقلید کرنا چاہتی ہیں اور اپنی طاقتوری کا ذریعہ یا نتیجہ اسے سمجھتی ہیں؟ یہ قانون قدرت ہے کہ جس قوم میں بے پردگی اور عورت مرد کا آزادانہ اختلاط عام شائع ہوتا ہے وہاں بے حیائی عام ہو جاتی ہے پھر رفتہ رفتہ اس کا عیب ہونا نظر انداز ہو

جاتا ہے۔ فرضی و خیالی فوائد کے سامنے بے حیائی کو گوارا کر لیا جاتا ہے۔ ہندو بیرون ہند میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ بے پردگی و اختلاط کی حالت میں فرد واحد ملوث و مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایسا ہونا بھی فطرت و قدرت کے خلاف ہے۔ صد ہا ہزار ہا نفوس مرد و زن محفوظ و معصوم رہتے ہیں لیکن جنس لطیف و صنف نسوان کے لیے یہ آزادی خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ مرد کو طعنہ دیا جاتا ہے کہ ”مذہب کے حکم کے باوجود اپنی نظریں نیچی نہیں رکھتا اور نفس پر قادر نہیں“ اور خود یہ بات یاد نہیں رکھی جاتی کہ عورت کو مذہب کا اس سے زیادہ حکم ہے۔ نظر اور آواز نیچی رکھنے کے ساتھ حسن و زینت کو بھی چھپانے کا حکم ہے۔ ناز و ادا، کرشمہ و غمزہ کے اظہار کی بھی ممانعت ہے۔ مقناطیس سے شکایت ہے کہ سوئی کو کیوں کھینچ لیتا ہے۔ سوئی سے نہیں کہا جاتا کہ تو الگ کیوں نہیں ہتی کیوں دوڑ کر چمٹ جاتی ہے آگ سے کہا جاتا ہے کہ تنکے کو نہ جلا تنکے سے نہیں کہتے کہ تو آگ کے پاس کیوں جاتا ہے۔ عورتوں کو اپنے شکووں کے سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جن مردوں سے وہ جنگ پر آمادہ ہیں وہ انھیں کے پالے سکھائے، پڑھائے ہوئے ہیں۔ بچہ پہلا سبق ماں کی گود میں سیکھتا ہے پھر ماں باپ دونوں سے تربیت پاتا ہے۔ پھر استاد سے تعلیم حاصل کرتا ہے۔ عورتوں کو متحدہ طور پر کوشش کرنی چاہیے کہ مذہب کی پابندی نہیں، دینی تعلیم حاصل کریں، اسلامی آداب و اخلاق حاصل کریں، قرآن شریف ترجمہ و تفسیر کے ساتھ پڑھیں۔ صحابہ و صحابیات کی سیرت پڑھیں نماز کی پابندی کریں۔ ہر نماز کے بعد دعا مانگیں، بچوں کو نماز روزہ کا پابند بنائیں، اسلامی احکام سکھائیں۔ حقوق اللہ و حقوق العباد سمجھائیں، خدا کا خوف، رسول کی محبت، اسلام کی عظمت، احکام و تعلیمات اسلامی کی فضیلت خود ذہن نشین کریں اور بچوں کو بتائیں۔ عدل و اعتدال کے معنی سمجھیں اور سمجھائیں غرض سچی مسلمان بنیں اور بچوں کو سچا مسلمان بنائیں۔ اب بھی تو عورتیں اجتماعی و اتحادی طاقت حاصل کر کے مردوں پر غالب آنا چاہتی ہیں۔ یہ بغاوت ہے اور اس کا انجام اچھا نہیں ہو سکتا اور اس سے ہر حالت میں نقصان عورتوں ہی کو پہنچے گا۔ وہ اپنی اس طاقت کو اس طرف مبذول کر سکتی ہیں اپنی اور گھر کی حالت کو درست کر سکتی ہیں، موجودہ مردوں، باپ، بیٹوں، شوہروں کو بھی اصلاح ذات و فلاح خانہ و عیال میں اپنا شریک و معاون بنا سکتی ہیں اور اس وقت کے گود کے بچوں کو جب دس بیس سال کے بعد وہ مدرسہ میں اور بیرونی دنیا میں بھیجیں گی تو سچے مسلمان ہوں گے اور یہ سب خرابیاں اور شکایتیں رفتہ رفتہ خود بخود رفع ہو جائیں گی لیکن اگر عورتیں پردہ اٹھانے پر ہی متبی ہوئی ہیں اور بے پردگی کے لوازم اختیار کرنے پر اصرار کرتی ہیں، تو اس کے نتائج و عواقب سے بچ نہیں سکتیں۔ کانفرنسوں، ریزولوشنوں، قانون کے

ذریعہ سے طاقتور بن کر مکمل اصلاح اور انسداد شکایت کر سکتا ایسے مستقبل بعید کا کام ہے جو حد نظر سے بھی دور ہے:

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیش عشق

رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

اور اس عرصہ میں آزادی و بے پردگی سے سوسائٹی میں جو خرابیاں پیدا ہوں گی، وہ پھر علاج ہو جائیں گی، جب تک عراق سے تریاق آئے گا مار گزیدہ ختم ہو چکے گا۔ اس ترکی بہ ترکی جواب کو پڑھ کر یہ شعر پڑھیے:

یہ کچھ سنا جواب میں ناظم ستم کیا

یہ کیوں کہا کہ دعوی الفت مگر غلط

(اخبار دہ بدہ، سکندری رامپور، ۶ مارچ ۱۹۳۹ء)



کو۔ ورنہ حقیقت میں جو اجتماع بطور وجہ اشتراک مد نظر ہو وہی قوم ہو سکتی ہے۔ مثلاً قوم مذہبی ہو تو ہندو مسلمان الگ الگ ہوئے۔ قوم ملکی میں یہ دونوں مل گئے۔ قوم نوعی میں تمام انسان افریقہ امریکہ یورپ و ایشیا کے داخل ہو گئے اور قوم جنسی میں اس سے بھی آگے بڑھ سکتے ہیں۔ لوگوں کے نزدیک کوئی وجہ اشتراک ہو میں اس لفظ قوم کو خاص اس جلسہ اسکول کے موقع پر قوم وطنی و قوم بچھڑاؤنی کے معنے میں استعمال کرتا ہوں۔

جس میں جملہ افراد وطن مشترک ہیں۔ ومن مذہبی حب الدیار لا ہلہا و للناس فیما یعشقون مذاہب اس آیت اور اس معنے کو مد نظر رکھ کر قومی غزل آپ کو سنانا ہوں جو میں نے بڑی ”گھن“ کھا کے تصنیف لطیف فرمائی ہے۔ لفظ غزل عاشقانہ مضمون کی نظم کو کہتے ہیں تو میری مختصر غزل میں ملاحظہ فرمائیے کہ رنگ تغزل کے ساتھ قومی و اسکولی مضمون آیا؟ اور اسکول کی حالت پر منطبق ہوئی یا نہیں۔ نئی صنعت یہ ہے کہ ردیف اول اور قافیہ آخری اگر پسند افتد:

قومی غزل

اے مہرباں نہیں ہیں مجھے کچھ شکایتیں
بے مہری حضور کی نہیں کچھ حکایتیں
گر کیجیے معاف یہ جرأت غلام کی
عہد وفا کی عرض کروں کچھ ہدایتیں
ہوں آپ جیسے وعدہ خلافوں کے تذکرے
مجھ سے وفا شعار کی ہوں کچھ روایتیں
جیتا بیچے نہ دل بہت غافل کے ہاتھ سے
امداد غیب کی جو نہ ہوں کچھ حمایتیں
جی جائیں کشنگان جفا و ستم حضور
ہو جائیں گر نگاہ کرم کی عنایتیں

اب میں اپنا مطلب بجائے نثر و اسپیج کے ایک نظم کے پیرایہ میں عرض کروں گا۔ شعر گوئی کی مجھے مشق نہیں اور اس کو بہتر مشغلہ بھی نہیں جانتا۔ اس لیے کہ مجھ سے اچھے شعر ہوتے نہیں اور بڑوں کو جی نہیں چاہتا:

ع کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

[ہم رونے پہ آجائیں.....]

ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہا دیں
شبہم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا
تمہیدادو شعر آپ کو سناؤں کہ اگر در رسیدہ دل اور گداز قلب ہو تو رو پڑو چنانچہ تجربہ ہو چکا ہے

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ
بس آج کی شب بھی سو چکے ہیں
سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کئی رات
ہونے کو سحر آئی ہے ظالم کہیں مر بھی

لوگ آج تک ہم جیسے وضع قطع کے آدمیوں کے منہ سے قوم کا نام سن کر گھبرا جاتے ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ کوئی قومی کام کرو اور ہمدردی قومی کرو اور اگر ہمدردی اسلام کا لفظ چوڑے پانچے والے کے منہ سے نکل گیا تو (تو) تو بہ ہی بھلی۔ اس لیے آج میں قوم کے لغوی معنی عرض کر دوں۔ (واکنٹر لا یعلمون) اس مادہ کے معنی ہیں انتظام و التیام بناوٹ میں ملاوٹ میں چنانچہ تو ام اسی سے نکلا ہے جس سے مر بے یا زردے کا ”التیام“ میسر ہوتا ہے۔ ”قیام الملة والدين کسی کا نام اسی معنے پر ہے۔

قیم اور قیوم کے یہی معنے ہیں۔ ناظم کار، سیکرٹری و انتظام کنندہ کو قیم و قیوم کہتے ہیں۔ جناب باری عز اسمہ جو مدبر کائنات ہے۔ اس کو قیوم بصیغہ مبالغہ اس لیے کہا جاتا ہے۔ قوم کو قوم اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ مجتمع و منتظم ہوتے ہیں۔ جس لفظ کی طرف غور کرو اور اس میں یہ مادہ مشترک ہو تو یہی اشتراک معنی نظر آئے گا۔

انسان متہدن و مجتمع العاشرت ہے اس لیے جہاں اس کے افراد قریب قریب نظر آتے ہیں عوام اسی میں قوم کا انحصار کر لیتے ہیں۔ مثلاً مسلمان اپنی قوم کا فرد مسلمان کو سمجھتے ہیں اور ہندو ہندو

پھر مولوی نذیر احمد خان مرحوم کی ایک نظم کے ردیف وقافیہ کا تتبع کیا ہے جس میں ردیف پتھر ہے اور ایسی سنگاں کہ فکر تو مجال جولانی نہیں رکھتی۔ ان کا مصرع ہے:

ع قوم کو خود قوم کے منہ پر برا کہنے کو ہیں
مجھے اس قدر عرض کرنا ہے کہ

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو رو سیاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے
سب باتوں کا مصداق پہلے میں ہوں پیچھے اور ہیں۔ امید ہے کہ نظر غور و تعمق، عبرت و بصیرت سے سماعت فرماویں گے:

آج کے جلسہ میں ہم کیا جانے کیا کہنے کو ہیں
قوم کو خود قوم کے منہ پر برا کہنے کو ہیں
ہم برے ہیں یا بھلے لیکن بری نیت نہیں
بھائیو مانو نہ مانو ہم بھلا کہنے کو ہیں
اپنا گھٹنا کھولیے اور لاجوں مرے آپ ہی
کیا کہیں ہم آپ سے کس طرح کیا کہنے کو ہیں
جو وطن کی منفعت سمجھیں گے بتلا جائینگے
آئے اپنی فہم میں جو فائدہ کہنے کو ہیں
پہلے سب کچھ تھے بحمد اللہ ہم کیا کچھ نہ تھے
آج تو انسان بھی واحسرتا کہنے کو ہیں
پہلے قابل اور ذکی مشہور تھے نزدیک و دور
آج ہم بدقسمتی سے اذکیا کہنے کو ہیں
ہے غضب جن کے سلف تھے مصدر فضل و کمال
آج ان کے ناخلف حرف آشنا کہنے کو ہیں

رونے کی بات ہے اور امر واقعی ہے۔ نہ مبالغہ نہ غلو کہ اس پچاس برس میں پچھراویں جیسے مقام میں کوئی شخص پہلوں کی کمی پورا کرنے والا نہ ہوا۔ پہلے کیسے فاضل و امیر، غنی و فقیر ہوئے مگر ان کے نام لیوا ویسے نہ ہوئے۔ مثلاً بعض نے اپنی تکمیل دماغی سے (کہ اس کا نام ترقی انسانی ہے) تصنیف و تالیف کیں۔ کسی نے مخلوق کو فائدہ پہنچایا، کسی نے کسب مال و جلب منافع کیا کہ صفر سے لاکھوں کی جاگیریں چھوڑ گئے مگر ان کے پس ماندگان نے ترقی تو کجا رجعت و تہمت کی۔ جس کا

سبب ایک اور صرف ایک ہے کہ ترقی دماغی میں قدم نہ رکھا۔ ورنہ علم وہ چیز تھا کہ تمام مصائب و منافع سے صحیح طور پر آگاہ کر دیتا ہے اور ہزاروں لغزشوں سے بچا دیتا ہے۔

مولویوں کی پچھراویں کہلاتی تھی مگر انصاف سے کہو کہ آج پچھراویوں کے انتساب سے کوئی کسی مولوی کو جانتا ہے۔ جیسے مولانا نور اللہ صاحب مغفور و مولوی محمد علی صاحب مرحوم کو ہر اہل علم کم از کم ہندوستان کا متعلق پچھراویں جانتا ہے۔ مولوی عبداللہ صاحب مبرور یا مولوی ابراہیم علی صاحب تاجور کو سن جہات ششی کتنے لوگ باہر کے تاعرب جانتے ہیں۔ آج کسی اعتبار سے کسی کو کوئی جانتا ہے؟ یاد رکھنے کی بات ہے کہ قوم نہیں مرا کرتی بلکہ قوم کی عزت و فضیلت بلکہ خصوصیت مرجاتی ہے تو وہ قوم مرجاتی ہے۔ مثلاً بھیل، گوڈ، یا مغل، لودھی کہاں گئے؟ سب ہیں بلکہ شمار میں زیادہ ہیں مگر خصوصیات و فضائل نثار ہو گئے۔ اس لیے اب نظر نہیں آتے۔ نہ کوئی ہے نہ کوئی رہے۔ سدا بس رہے نام اللہ کا۔

جناب باری عزاسمہ کی طرف سے کوئی بخل و حرج نہیں۔ ایسے ایسے ذہین و ہونہار بچے پچھراویں میں پیدا ہوتے ہیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔

کاش ان میں سے بعض ایسے عالم و فاضل ہوتے کہ مصر و شام تک مشہور ہوتے۔ بعض ایسے کامل و ماہر ہوتے کہ حج، کلکو، وکیل و انجینئر ہوتے اور موٹروں میں یہاں آتے تو خواجہ مہران پنج کینٹی پچھراویں سڑکیں درست رکھتے اور کبھی وہ لوگ بوجہ ہم وطنی و برادری میرے گھر یا کسی کے گھر محلہ بٹا آباد میں جایا کرتے تو ۹ فٹ کے غار کی نوبت ہی نہ آتی۔ بعض صرف انشا پرداز و مضمون نگار ہی ہوتے کہ ہندوستان بھر میں دھوم مچی ہوتی اور جب سب گرم رائے ایڈیٹر چپ ہوتے تو وہ نرم رو ہونے کے سبب قوم و ملک کو نفع پہنچاتے۔ بعض افراد روپیہ کماتے، تجارت کرتے اور پچھراویں کم از کم دو چار ضلعوں کے لیے مرکز تجارت ہوتا۔

غرض انھی بچوں سے سب کچھ بن سکتے تھے اور بن سکتے ہیں۔ اگر نعمت خداوندی کی قدر کی جاتی اور خود بھی کوئی سعی کرتا۔ اسی خیال کو ان الفاظ میں عرض کیا ہے۔ یا یہ شعلہ ہائے آہ جگر سوز ان حرفوں میں زبانه ریز ہوئے ہیں:

ہم میں کتنے مولوی ہیں، کتنے ہیں انشا طراز

مولوی یا منشی جی ہم با جیا کہنے کو ہیں

مولوی کے معنی ہیں مولائی اور یہ بڑا زبردست و قابل تعظیم لقب ہے کہ اس کا اہل ہونا کارے دارد۔ مگر ہمارے یہاں کس بے تکلفی سے ہر ایک کے لیے بولا جاتا ہے کہ تو بہ ہی بھلی۔ بلا مبالغہ

جن کو اردو لکھنا پڑھنا ہی نہیں آتا جن کا اعلیٰ درست نہیں جن کا شین قاف بھی صحیح نہیں ان کو مولوی کہا جاتا ہے۔ اللہ تیری شان کے قربان جائیے۔ ہر شخص سمجھتا ہے کہ میں پڑھا لکھا ہوں و منہم انا۔ اور اس کے پاس اس دعوے کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ مردم شماری میں اس کو اور اس کے ہم عصر برادران کو خواندہ لکھا گیا ہے۔ دوسرے گرد و پیش سے اس کو مولوی صاحب کی آوازیں آتی ہیں۔ خط پڑھ لیتے ہیں گو کبھی گھسیٹ میں تامل ہو جاتا ہے سو یہ اس راقم کا قصور ہے اخبار پڑھ لیتے ہیں اگرچہ بعض انگریزی الفاظ میں جی الجھتا ہے اور فہم قاصر رہتی ہے مگر ہم ہیں پڑھے لکھے۔ ہر کہ شک آرد کا فکر گرد۔ مطلب نکل ہی آتا ہے۔

آج کل تو صرف اپنے منہ میاں مٹھو ہیں ہم
اس غلط رائے پہ مطلب آشنا کہنے کو ہیں
اگر ہمارے بڑے اچھے تھے تو وہ فسانہ ہو گئے اور ان کی بزرگی واقعہ تاریخی رہے گا۔ آج اگر ہم ان کے قدم پر قدم رکھیں تو یہ دعویٰ مدلل ہوگا ورنہ ہڈیاں سے کم نہ ہوگا۔ آج تو سچا حال یہ ہے:

ہم بنے افعال سے اپنے ریکس الاشقیاء
بس بزرگوں کو امام الاتقیاء کہنے کو ہیں
سب بڑے اصرار سے پچھراؤں کے نقصان و عیب
رات دن شام و سحر صبح و مسا کہنے کو ہیں
یاں کی حالت پر تبرا کرتے ہیں چھوٹے بڑے
ہر کسی کا ایک دفتر عیب کا کہنے کو ہیں
آپ کو دیکھیں تو پائیں گے سراپا نادرست
ہائے لیکن دوسرے کو بے شکا کہنے کو ہیں
کان ہم سب کے اگر ہیں تو برا سننے کو ہیں
اور ہم سب کی زبانیں بس برا کہنے کو ہیں

یہ تو غیبت و چغل خوری اور خوبی معاشرت کا بیان تھا۔ ہزاروں اخلاقی و روحانی خوبیاں ہیں ایک دو جسمانی محاسن قافیہ کی شرط کے سبب نکل گئے ہیں برانہ مایہ۔ میں اوروں سے کم نہیں:

دائم الامراض بزدل اور گھر گھسنی ہوا
سب زبانی حرکتیں اور مردودا کہنے کو ہیں

ایک آیت شریفہ یاد آگئی اور شعر میں اس کا ترجمہ نامکمل ہو گیا۔ غور کرو تو بڑی بات ہے اور

ہمارے وطن شریف میں وہ صفت بدرجہ تمام پائی جاتی ہے میرا محبوب وطن ہے۔

بھر دیں عجب ادا میں اس شوخ سہمتن میں

اک ٹیڑھ سادگی میں ایک سیدھ بانگپن میں

کسی آبادی میں انسان جب زیادہ ہوئے اور خاندان مختلف ہو گئے تو ان کی شناخت کے لیے ضرورت پڑی کہ ان کے نام علیحدہ علیحدہ رکھ دیئے جائیں۔ اس وجہ سے محلہ، ٹولہ یا خاندان و قبیلہ کسی خاص نام سے منسوب ہو جاتا ہے مثلاً اری یہ حصے پیر جیون میں جاویں گے یہ جٹا مہج کے پیر زادوں کے ہیں یہ گوندہ پنجیری شیخ زادوں کی ہے۔ یہ خوان چھوٹے والوں کے یہاں کا ہے۔

الفاظ امتیاز صرف پتے نشان کے لیے ہوتے ہیں نہ کہ طعن و تشنیع اور فرقہ بندی کے لیے کہ فلاں قبیلہ ہمہ تن تجمیع الافراد قابل اعتراض و کشتی ہے اور فلاں قابل محبت و رحم۔ برے بھلے ہر گروہ میں ہوتے ہیں اور عیوب افراد خاص میں ہوا کرتے ہیں نہ جماعت میں اور پچھراؤں میں بوجہ جہالت و کثرت فرصت یہ حال ہے کہ ایک خاندان دوسرے کو نہایت نفرت و حقارت سے دیکھتا ہے اور کسی طرح کی ہمدردی اس سے نہیں رکھتا۔ حالانکہ حقوق ہمسائیگی و براداری و وطن کے اعتبار سے ہر شخص قابل ہمدردی و خیر خواہی ہے۔ دیکھو خدا تعالیٰ تو فرماتا ہے:

وجعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا

اس فرقہ بندی و گروہ پرستی کے سبب مقصد آفرینش کو بدلتے ہو۔ ذلک هو النحسران المبین۔

جماعت کے فوائد تعلیم

لیکن جتنی بڑی جماعت بناؤ گے اور جس قدر ایک دوسرے کی طرف سے دل میں گنجائش و محبت بڑھاؤ گے اسی قدر منافع اجتماعی سے فائدہ اٹھاؤ گے۔ اگر کسی ایک فرد سے کوئی غلطی یا فتنہ پرداز یا خلاف محبت و اتفاق کوئی حرکت ہوگئی تو سب کی کیا خطا۔ جب سب ایک ہو گئے تو نہایت آسانی سے اس فرد کی کمزوری کی اصلاح و تلافی کر سکو گے۔

تم چڑانے طعن کرنے کا بیان دینے لگے

پیرزادہ، شیخ زادہ ای فتا [کہنے کو ہیں]

ایک بیچارے سے گر کوئی خطا سرزد ہوئی

آپ اس سارے قبیلے کو برا [کہنے کو ہیں]

کام آئے گا ہمارے ہم کو بھی بتلائیے

آپ اس کا عذر کیا پیش خدا [کہنے کو ہیں]

بستی میں تین طبقے ہوا کرتے ہیں اور گاؤں گھونٹ میں صرف دو۔ اعلیٰ اوسط ادنیٰ طبقہ اعلیٰ کی وجہ سے سوسائٹی میں ہر قطع کی زندگی اور افسردگی آیا کرتی ہے۔ یہاں اعلیٰ تو موجود نہیں اواسط نے جو کچھ مذاق سوسائٹی بنایا ہے وہی ہے۔ اواسط یہاں علی العموم صاحب زمین ہیں۔ زمیندار کہتے ہوئے تو تامل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ مہاراجہ کشن پرشاد اور سر آسمان جاہ زمیندار ہیں تو یہاں کے اواسط کس گنتی میں ہیں۔ بہر حال کوئی طبقہ ہو کسب و عمل سے اس کے قوی حرکت میں آتے ہیں اور کچھ کام کا ہوتا ہے ورنہ ناکر سکی وکابی تمام قوی کو زنگ لگا دیتی ہے اور جتنا تھایا ہو سکتا تھا اس کو بھی بے کار کر دیتی ہے۔ زمینداری میں سب خوبیاں ہیں مگر یہی بڑا عیب ہے کہ وہ کامل و غیر کا سب بنا دیتی ہے۔ اس لیے ایک وقت بچپن پر اس کا کام ہے اور باقی سال آرام۔ باپ اور دادوں کے بچے ہوئے کلڑوں کا سہارا روز پیدائش سے کسب و عمل کی طرف سے مطمئن سا بناتا ہے اور آہستہ آہستہ اگر اور سامان بھی مل گئے تو بے کار ترین بنا دیتا ہے مثلاً گاؤں کا کام کرنے والا کوئی ملازم یا بھائی چچا مل گیا تو بس کتنا ہی وعظ و نصیحت کرو گا و بجاؤ میاں ہو چکے۔ دوسرے بے نیازی کے سبب نخوت و غرور لازم غیر منفلک ہے اور ماشاء اللہ تیسرے کم مہری و بے اخلاصی کے غور کر تو بے نیازی کے آخری مراتب وہ ہیں۔ نعوذ باللہ من سرور انفسنا و من سیات اعمالنا ان مضامین پر مجھے پیکچر دینا نہیں ہے۔ اس لیے مختصر الفاظ [میں؟] نظم کر دیا ہے اس لیے کہ یہ اشعار پچھلے تمام کمزوریوں کا سبب اصلی ہیں:

[ترکہ؟] متروکہ آبا نکما کر گیا
ہم زمیندار و رئیس با صفا کہنے کو ہیں
حیثیت پوچھو تو بارہ پندرہ یا سو پچاس
اس پہ ہم اہل دول اہل (غنا؟) کہنے کو ہیں
مرض تو تسلیم کوئی بھی اٹھا بہر علاج
یوں تو سب لیڈر وطن کے نا خدا کہنے کو ہیں

ہر شخص کو ان عیوب کا شاکہ پائیے گا اور ایسے دلسوزانہ اور ہمدردانہ لہجہ میں کہ اس سے زیادہ رنج و صدمہ، تنزل و بستی وطن کا کسی کو نہیں اور سب صاحب ترکیبیں بھی بتا دیتے ہیں مگر کوئی حصہ عمل کا اس میں سے کرنا ان کے لیے حرام ہے۔ اس لیے مرض بڑھتا چلا جاتا ہے اور بیمار نا سوزدہ جاں بلب ہے۔ علاج کے لیے ایک بات مسلم ہے کہ جس قدر وسعت معلومات و تقویت فکر ہوگی وہی مفید ہے یعنی جب تک پڑھ لکھ کر اپنی حالت کا احساس نہیں ہوگا۔ کیا خاک تدبیر مناسب کی

طرف متوجہ ہوں گے۔ اس قدم اولین یعنی تعلیم کے بہت سے راستے ہیں اور مجھے اعتراف ہے کہ درست راستے کچھ اور ہیں لیکن منجملہ تمام راہوں کے ایک راستہ مروجہ ملک و پسندیدہ قوم [کی] تعلیم و آسانی و معاشرہ کا ہے جو مہتمان سکول نے اپنے میدان عمل کے لیے تجویز کیا ہے اور خواہ کوئی کتنی ہے کج بحثی و سخن پروری کرے تمام بزرگان وطن نے اس کو پسند کیا۔ مگر لطف یہ ہے کہ باوجود اعتراف منافع اس کام میں باسٹھناے دو تین بزرگوں کے اور کسی نے امداد نہیں دی۔ انتہا یہ ہے کہ مشورہ ورائے تک سے محروم رہے۔ اس کا ایک سبب تو اس شعر میں بندھ گیا ہے:

مل کے کوئی کام کرنے کا ارادہ ہی نہیں

ہاں مگر افراد کو ہم نا سزا کہنے کو ہیں

جن کو سلیقہ و تجربہ اجتماعی کاموں کا ہو جاتا ہے وہ بڑی آسانی سے آباد ہو جاتے ہیں اور ادنیٰ سی شرکت سے بڑے سے بڑے کام کر لیتے ہیں۔

میں حیران ہوں اور کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ باوجود تمام قسم کے رفع شبہات کے پھر کیوں بزرگان وطن اسکول کی مدد نہیں کرتے۔ اب کے سال کوئی مخالفت عارضی و دائمی کسی قسم کی نہیں ہوئی۔ بچوں کا نفع تسلیم ہے۔ اسکول کا کام اسکول کے اسٹاف کی محنت و توجہ قلبی سے ایسا قابل فخر ہوا کہ رکنا نرڈ اسکول کا بھی باعتبار نتیجہ ایسا نہیں ہوتا یعنی جس درجہ سے لڑکا یہاں سے گیا اگلے درجہ میں بعد امتحان بلا دقت لے لیا گیا۔ اس سے زیادہ کی آپ اتنے تھوڑے سے خرچ میں کیا امید کر سکتے ہیں اسکول اسٹاف قابل مبارکباد ہے۔ خصوصاً جناب ہیڈ ماسٹر صاحب کی ہمدردی و جان کاہی۔ اعتراض کرنا مشکل۔ کیوں صاحب اگر قومی کام تھا تو کبھی کوئی صاحب مدرسہ جانے یا کاغذات جانچنے کی تکلیف تو گوارا فرماتے۔ ممکن ہے کہ میکسٹری یا محسن روپیہ کھا گئے ہوں۔ آج کوئی خاندان ایسا نہیں جس کا بچہ نہیں پڑھتا اور اس کے یہاں سے کوئی پیسہ کسی صورت میں نہیں آیا۔ پھر یہ کب جائز ہے کہ میرا یا میرے بھائی کا روپیہ مفت ضائع ہو جائے مگر بے پروائی کا کیا علاج:

بھائی مرتا ہو تو پانی بھی نہ دیں ہم مرتے دم

ہم ابھی حضرت عزیز و آشنا کہنے کو ہیں

آج پچھرا یوں میں کون ہے جس کا بھائی جھنگ کمیٹی اسکول کا مہر نہیں اگر اسکول کمیٹی کے بھائی غلط راستہ پر تھے تو ان کو غلطی سے آگاہ کرنا اور نکالنا کیا دوسرے بھائی کا فرض نہیں:

اگر بنی کہ ناپینا و چاہ است
اگر خاموش بنشین گناہ است

ہر کام میں نقصان ہوتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ مجھ سے زیادہ کوئی اسکول کے منافع پر منطبق نہیں لیکن جو کچھ رونا ہے وہ بے تو جہی قوم کا ہے۔ اگر ہمارے پاس روپیہ ہو تو کوئی عیب بھی نہ رہے۔ بابا روپیہ دو یا صحیح مشورہ امداد دو پھر کسر رہے تو کہنا۔ میں صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ چند بزرگ ایک جگہ بیٹھ کر سنجیدگی و ہمدردی کے ساتھ اس امر کا تصفیہ کریں کہ یہ کام جاری رہے اور اچھی طرح چلایا جائے یا ملتوی کر دیا جائے۔ میری اور مہتممان اسکول کی طبیعت میں خود رانی نہیں اگر صلاح نہ ٹھہرے تو قطعی توڑ دیا جائے۔ اگر پسند ہو تو چلایئے اور اجتماعی طاقت سے چلایئے۔ لوگ بڑے بڑے کام مل کر کر لیتے ہیں آپ یہ ذرا سا کام ہی کر لیجئے۔

پچھرا یوں میں چند مدرسے ہیں مگر ان کے مہتمم آپ کو [۹] شرکت کی تکلیف نہیں دیتے۔ کیا ذرا سا کام آپ سے مل کر نہیں ہو سکتا؟ آپ کو اتفاق نہیں ہوتا اور خدا کرے نہ ہونے سے غیروں سے چندہ مانگا تو اول تو خود شرم آئی کہ ایک پرائمری اسکول کے لیے مانگ رہے ہیں۔ دوسرے کتنوں نے کہا کہ آپ کی آٹھ دس ہزار کی بستی سے اتنا سا اسکول نہیں چلتا۔ بتائیے اس کا کیا جواب ہے؟

یہ کہہ دینا بہت آسان ہے کہ کوئی ایک چلا دے۔ ارے صاحب ایک کیوں چلاوے؟ سب تھوڑی تھوڑی مدد کریں، دیکھو چلتا ہے یا نہیں۔ ہم سے تو جتنے بزرگوں نے وعدے کیے تھے اگر وہ وعدہ پورا کر دیتے تو ہمارا کام چل جاتا مگر مسلمان اور وعدہ خلاف ہو، معاذ اللہ۔

میرا یہ خیال ہے اور اسی کی وجہ سے میں اپنی ہی خدمت اسکول کی کرتا رہتا ہوں کہ آج بستی میں جس کی اولاد ہے وہ یہ ضرور چاہتا ہے کہ تھوڑی سی انگریزی اسے ضرور آ جاوے۔ تو کاش پچھرا یوں میں ایسا انتظام ہو کہ بچہ اردو، قرآن، حساب، انگریزی تھوڑی سی تو پڑھ لے۔ آگے جو چاہے گا پڑھتا رہے گا یا نہ پڑھے گا لیکن اس کا انتظام ایسا اعلیٰ ہو کہ ہر شخص اپنے بچہ کو بخوشی بھیجے امیر ہو یا غریب۔ مگر یہ کام روپیہ کا ہے اور توجہ عامہ کا اور افسوس دونوں ندارد ہیں۔ مجھے سب پر حیرت ہے خصوصاً اپنے چھوٹوں سے بڑا شکوہ ہے کہ وہ اس کام کے معاملات بے بتائے سمجھتے ہیں مگر کسی کو توجہ نہیں۔ آخر کسب عمل اور نفع رسانی غیر کا فرض [۱۰]؟

خير الناس من ينفع الناس
افضل الاشغال خدمة الناس

ہنگ عزت خلاف شان ہے ایصال خیر
خود کو پھر کیسے بھلے مانس بھلا کہنے کو ہیں

صنعت:

[جن؟] سے تھی امید ان کو کھیل سے فرصت نہیں
یہ [نئے نوٹے؟] نرالے ناخدا کہنے کو ہیں
بھائیو للہ سوچو، سمجھو، لرزو اور ڈرو
سائی و عامل ہیں سچ مچ آپ یا کہنے کو ہیں
آپ کے بھائی جتنے بے پڑھے رہنے کو ہیں
یا کہ ان کو آپ کچھ لکھا پڑھا کہنے کو ہیں
بھائیو اچھی بری میری تمھاری کٹ گئی
یہ بڑے ہو کر مگر ہم کو [بڑا؟] کہنے کو ہیں

میں نے بہت کان کھائے اور بے مزہ شعر سنائے۔ صرف ایک بات کہنا باقی ہے کہ میں فخر یہ نہیں کہتا باوجودیکہ میں باہر رہتا ہوں میں نے اپنا فرض منصبی سمجھ کر جس قدر کام کیا ہے اور حکیم صاحب نے اپنی ہمدردی و ایثار سے جس قدر خدمت کی ہے اسی قدر کے لیے صرف دو [لوگ؟] جمع میں سے اٹھ کھڑے ہوں تو یہ کام بوجہ احسن چل پڑے۔ ورنہ اب کس بل تو ختم ہوئے۔ نیز مالی امداد جس قدر مولوی عبدالحفیظ صاحب و دیگر دو تین بزرگوں نے دی ہے اسی قدر تمام بستی اور شرکت کر لے تو کام بنے گا ورنہ قصہ ختم کرو۔ باز آیا میں دل لگانے سے

آج تک بھی ہم روادار ایک دھیلہ کے نہیں
ہاں مگر اسکول اپنی قوم کا [کہنے کو ہیں]
ذکر ہر خوبی کا اس کی [دیر پا؟] دینے کو ہیں
اور ہر لغزش پہ بے جا و بجا [کہنے کو ہیں]
مجھ سے جو حضرت ملیں تو بر سبیل تذکرہ
خیر سلا پوچھنے اور واہ وا [کہنے کو ہیں]
بزم آرائی کے اور محسن نوازی کے لیے

مجھ کو فرضی خدمتوں پر مرجھا [کہنے کو ہیں]
اور اگر کہیے کہ حضرت آپ بھی کچھ دیجیے
تو فسانہ قحط و حرب و جنگ کا [کہنے کو ہیں]
العجب ثم العجب ہمدردی و ایصال رقم
آپ ہمدرد عزیز و اقربا [کہنے کو ہیں]
کون ہے جس کا نہیں پڑھتا بھتیجا بھانجا
بے تعلق ، بے غش و بے مدعا [کہنے کو ہیں]
وعدہ کر کے سیکڑوں کا کھا گئے وعدہ خلاف
پھر بھی اپنے آپ کو وعدہ وفا [کہنے کو ہیں]

اگر ہماری بقایات موعودہ ہمیں مل جائیں تو ہم صبر کریں یا مٹکی فنڈ ہی کو سب صاحب قبول
فرماویں اور عام شرکت کر لیں۔

چندہ ہاتھ آئے نہ آئے ہم رہیں گے خیر خواہ
آپ کچھ دیجئے نہ دیجئے ہم دعا [کہنے کو ہیں]

(غیر مطبوعہ)

☆☆

تعبیر ارشادات قرآنی

۱۹۵۰ء

رشتہ فکر ناچیز حامد حسن قادری

۱۳۷۰ھ

(۱)

جو کچھ ارشاد خداوندی ہے
اس میں کچھ شک ہے نہ کچھ باعثِ ضد
کہہ دو عالم سے پیامِ اسلام
إِنَّمَا إِلَهُ الْإِلَهِ وَاحِدٌ

(۲)

سمجھیں کہ خدا کو کیا ما و شما
ممکن نہیں سائنس بھی ہو راہ نما
ہے ارض و سما پہ چھائی اس کی کرسی
کھا کہ وَلَا يَمُوتُ وَلَا يَنُودُهُ جَفَظُهُ مَا

(۳)

تم کو اگر ہے اللہ کی چاہ
قرآن میں ہے اس کی ایک ہی راہ
سن لو حبیبِ حق کی رہائی
فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ

(۴)

دل ہے وقف ہوا و نذر ہوں
سخت کافر ہے دل ، خدا کی پناہ
دل ہے یا کوئی جہنم کا بکرا
مَا أَهْلَ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۚ

(۵)

حق پر باطل کو دو نہ ترجیح
رہبر کیا ہو جو خود ہے گم راہ
بنا چاہے جو کفر ہادی
کہہ دو اِنَّ الْهُدٰى هٰذَا لِلّٰهِ ۚ

(۶)

رہ راست راہ حق است [رو]
پئے منکران خدا مرو
نہ رکھ ان سے دین کا معاملہ
نہ ادھار تیرہ نہ نقد نو
وہ کھائیں گندم اگر کبھی
تو سمجھ کہ رکھتے ہیں جو ہی جو
ملے کیوں کر ان کو صراطِ حق
نہ لگے کبھی جو خدا سے کو
لگی مہر وہ دل و گوش پر
نہ وہ حق شناس نہ حق شنو
ترا ان کا ساتھ ہو کس طرح
ترا ایک آلہ اور ان کے سو
جو ہدایت ہو ان کو کفر سے

ملے دین حق سے حیات نو
یہ خدا کا فیصلہ صاف ہے
فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدْ هَمْتُمْ ۙ

(۷)

سرِ مسلم ہے خم حکم خدا پر
اسی کا اصل میں اسلام ہے نام
یہی دنیا، یہی عقبے، یہی دیں
یہی منزل ، یہی مقصد، یہی کام
نہ ہو وہ پیرو طاغوت و طغیاں
کہہ: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۚ

(۸)

ذرا آنکھ کھولو ، ذرا دل میں سوچو
اگر تم ہو دانا ، اگر تم ہو بیٹا
اگر تم ہو مومن تو بن جاؤ مسلم
رضائے خدا میں ہو مرنا کہ جینا
خدا کو نہ زہار مقبول ہوگا
وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا ۚ

(۹)

معبود ہو ہر شجر حجر ہو کہ و مہ
سمجھ لو خود انسان کی توہین ہے یہ
مالک وہ ہے جو گناہ چاہے بخشے
سن رکھو کہ لَا تَغْفِرُ اَنْ يُشْرَكَ بِهِ ۚ

(۱۰)

نہ دیکھا کفر و دیں کو کھول کر آنکھ
کھلا تھا حق و باطل کا دوراہا
خدا سمجھا زر و زور و زمیں کو

نہ اس معبود واحد سے نباہا
نہ مانو تم کہا نفس و ہوا کا
اگر معبود انھوں نے کوئی چاہا
وہی کہہ دو جو موسیٰ نے کہا تھا
اَغْيِرَ اللَّهُ اَبْنُكُمْ اِلٰهًا
(۱۱)

ضلالت بری ہے ہدایت کے بعد
یہی دیکھیے گا ، کہیں دیکھیے
سزا سخت سے سخت ہے کفر کی
ہیں شاہد زمان و زمیں دیکھیے
کلام خدا: اِنْ يُّؤَدُّ فُلٌ
مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلٰی دیکھیے
(۱۲)

عیاں دیکھو گے حق کا جلوہ بے غلو و لا یغلو
اگر چاہو تو دنیا بھر میں پھر کر چار سو دیکھو
نہ ہو اتمام نور حق بالآخر یہ نہیں ممکن
وَيَا بٰی اِلٰهٍ اِلَّا اَنْ تُنَزِّلَ نُوْرًا دیکھو
(۱۳)

راہ عرفاں نتواں بیودن
چشم اگر وا نبود سالک را
سامنے دفتر عالم ہے کھلا
مگر انسان [رہا] ہے بے فکر
عقل میں قوت پرواز بھی ہے
یا یوں ہی پال رکھا ہے شکرا
کیجیے مقصد قرآن پہ نظر
اَنْزَلَ اِلٰهَ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا

(۱۴)
گرامیں نار میں یا لے کے جائیں جنت میں
تمہیں تمہارے عمل ، دوسروں کو ان کے عمل
ہوا کرے کوئی گمراہ ، تم چلو حق پر
عَلَيْكُمْ اَنْفُسُكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ۱۴
(۱۵)

ہوتا ہے رنگ آلود جب عصیاں سے دل کا آئینہ
گویا جبین ماہ پر لگتا ہے اک عیب کلف
توبہ سے مٹ جاتا ہے داغ اور دور ہو جاتا ہے رنگ
ارشاد ہے: اِنْ يُّنْتَهِوا يَغْفِرْ لَهُمْ مَا قَدْ سَلَفَ ۱۵

(اخبار دہدہ سکندری رامپور
۹ مارچ ۱۹۵۱ء)

☆☆☆

- ۱۔ بے شک اللہ ہی تنہا معبود ہے۔ (سورۃ النساء۔ آیت ۱۷۱)
- ۲۔ اور آسمان اور زمین کی حفاظت اللہ پر گراں نہیں۔ (سورۃ البقرہ۔ آیت ۲۵۵)
- ۳۔ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تم کو محبوب بنا لے گا۔ (سورۃ آل عمران۔ آیت ۳۱)
- ۴۔ جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا۔ (سورۃ الانعام۔ آیت ۱۳۵)
- ۵۔ اللہ کی ہدایت ہی صحیح ہدایت ہے۔ (سورۃ الانعام۔ آیت ۷۱)
- ۶۔ پس اگر وہ اسلام لے آئیں تو راہ راست پر آجائیں گے۔ (سورۃ آل عمران۔ آیت ۲۰)
- ۷۔ بے شک اللہ کے نزدیک اسلام ہی دین حق ہے۔ (سورۃ آل عمران۔ آیت ۱۹)
- ۸۔ جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی اور دین چاہے گا وہ ہرگز قبول نہ ہوگا۔ (سورۃ آل عمران۔ آیت ۸۵)

۹۔ اللہ تعالیٰ شرک کرنے والوں کو معاف نہ کرے گا۔ (سورۃ النساء۔ آیت ۱۱۶)

۱۰۔ کیا میں تمہارے واسطے اللہ کے سوا کوئی اور معبود تلاش کروں۔ (سورۃ الاعراف۔ آیت ۱۳۰)

۱۱۔ اگر وہ پھر گمراہ ہو جائیں گے تو پہلے گمراہوں کا انجام ان کے سامنے موجود ہی ہے۔

(سورۃ الانفال۔ آیت ۳۸)

۱۲۔ اور اللہ اپنے نور کو مکمل کر کے ہی رہے گا۔ (سورۃ التوبہ۔ آیت ۳۲)

۱۳۔ اللہ نے تمہاری طرف ذکر و فکر کی کتاب نازل کی ہے۔ (سورۃ الطلاق۔ آیت ۱۰)

۱۴۔ تم اپنے نفسوں کی حفاظت کرو کسی کی گمراہی سے تم کو نقصان نہ ہوگا۔ (سورۃ المائدہ۔ آیت ۱۱۵)

۱۵۔ اگر وہ باز آجائیں گے تو پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ (سورۃ الانفال۔ آیت ۳۸)

☆☆

حالی اور پیروی مغربی

نقد و نظر بامزہ

۱۳۶۵ھ

انتقاد و لکچس منظوم

۱۹۴۶ء

مولانا حالی کے اس شعر پر کئی مہینے سے اخبار نظام لاہور میں بحث جاری رہی ہے:

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں

بس اقتدائے معصی و تہر کر چکے

بعضوں کی رائے ہے کہ ”پیروی مغربی“ سے مراد شاعری میں طرز مغرب اور نظم جدید کی پیروی ہے، اور بعض

کہتے ہیں کہ فارسی کا شاعر مغربی تہریزی مراد ہے۔ میں ”پیروی مغرب“ کا موید ہوں۔ میں نے حکیم میں دوسروں

کی رائے پر تبصرہ کیا بعضوں نے اس کو ذاتی حملہ تصور کیا اور شکایت کی۔ اس کا تاثر یہ قطعہ ہے:

مرا کام تنقید شعر و سخن ہے

ہمیشہ اسی فن کو میں نے نباہا

سخن میں اگر عیب دیکھا، بتایا

ادب کا ہنر تھا تو اس کو سراہا

مذلل برائی، مہربن بھلائی

نہ بے وجہ ”ادھوا“ نہ بے بات ”آہا“

غلط بات لکھتا نہیں ضد سے ہرگز

تہ یزداں، بہ قرآن، بہ یاسیں، بہ طابا

کبھی قومیت میں نکالیں نہ شاخیں

کبھی خلق و خو کا تجسس نہ چاہا

یہ ممکن ہے جاہل کو جاہل تو کہہ دوں

جلا ہے کو کہتا نہیں میں جلاہا

یہی ہے جو شاگرد لکھتے ہیں ان کو
صناعت مآبا، ہنر دستگاہ
مگر شعر حالی سے کھلتی ہے قلعی
یہاں زخم سے ان کے چھنتا ہے پھاہا
وہ پہنچے نہیں مغرب و مغربی کو
پھرے چھانتے گو بہت یہ دوراہا
سنی ان کی نا گفتنی رائے جس نے
معا رکھ کے ہونٹوں پہ انگلی کہا ”ہا!“
”نہ ہر جاے مرکب تو اس تاخت آخر
پر باید انداخت ناچار جاہا“

خدا جانے حالی کا مقصود کیا تھا
وَمَا تَكُنْ شِعْرُهُ لَا تَزَاخَا
وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
کہ سچ ہے: اِلٰہِ رَبِّكَ مُنْتَهٰہُ
بس اے قادری تا کے بذلہ سخی
کہ بے حد و پایاں توانی است ”ہا ہا“

۹ ستمبر ۱۹۴۶ء
(غیر مطبوعہ)

۱۔ سورہ ہود۔ آیت نمبر ۱۲۳
۲۔ سورہ النازعات۔ آیت نمبر ۴۴

☆☆☆

حالی اور پیروی مغربی

(مجھے نہ شاعری کا دعویٰ نہ ”ماعری“ کا۔ مگر ”حالی اور پیروی مغربی“ کے مسئلہ سے کچھ ”غیر معتدل“
دلچسپی پیدا ہو گئی ہے اور کچھ طبیعت کی شوقی کا بھی گنگا رہوں۔ یہ ایک خیال آ گیا کہ اس بحث کو نظم کر دیا
جائے۔ مگر اب قافیہ پیمائی کرتے کرتے بڑی دور نکل گیا ہوں۔ آپ اس کو ”دراذ نفسی“ کہیے۔ میرا عذر ہے
کہ ”لذیذ بود حکایت دراز تر گفتن“ اپنی نظم کی کسی خامی و کمی کے متعلق اعتذار کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ البتہ ان
شعراے عظام (حالی۔ غالب۔ مصطفیٰ) کی ارواح سے معذرت خواہ ہوں جن کے اشعار کو میں نے اس نظم کی
زمین میں لا کر سرخ کیا ہے۔ قرآن کریم میں صورت کو سرخ کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ اس لیے خدا اور بندوں
دونوں کا گنہگار ہوں۔ لیکن باوجود شوقی و مزاج اور طعن و طنز کے اصل تیہرہ بالکل اٹل اور قطعی ہے اور میں اس کو
اول ہی سے آخری کہہ رہا ہوں۔ بہر حال یہ تیہرہ منظوم حاضر ہے۔

”چل رہے خاے بسم اللہ اب!“ _____ حامد حسن قادری از آگرہ مورخہ ۲۵ اگست ۱۹۴۶ء

شعر کے حالی کے ہے بحث آجکل
لوگ معنی دیکھیے پہنائیں کیا
وہ تو جو کہنا تھا کہہ کر چل دیے
ان کا مقصد سمجھیں کیا سمجھائیں کیا
اب وہ خود مطلب بتانے کے لیے
عالم بالا سے نیچے آئیں کیا
چھوڑی ہے حالی نے گویا مہلجروی
دیکھیں یہ پھول آگ اب برساکیں کیا
مر گئے لیکن نہ چھوڑی چھیڑ چھاڑ
”جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا“ ل

سچ ہوا حالی پہ غالب کا یہ قول
 ”مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا“ ۲
 خیر یہ تو دل لگی تھی حق یہ ہے
 مطلب حالی میں اب شک لائیں کیا
 کہہ گئے ہیں وہ تو صاف اس شعر میں
 اس سے واضح تر بھلا فرمائیں کیا
 ”ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
 راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا“
 راگنی گانی ہے گویا وقت کی
 مقتضائے وقت کو ٹھکرائیں کیا
 شاعری میں بیرونی مغرب کی ہو
 پیچھے میر و مصطفیٰ کے جائیں کیا
 ہے یہی حالی کا مضمون بالیقین
 یہ نہ فرمائیں تو وہ فرمائیں کیا
 ان کو انگریزی ادب کا ذوق تھا ۳
 فارسی اردو کی غزلیں بھائیں کیا
 تھی نظر میں خوبیِ نظم جدید
 پھر وہ خاطر میں غزل کو لائیں کیا
 جب غزل میں رنگت اگلی سی نہیں ۴
 پھر وہی دھڑپٹ الاپے جائیں کیا
 ہو چکا ہنگامہ مدح و غزل ۵
 شادیانے لاش پر بجوائیں کیا
 یہ نمونہ ہے غزل میں عشق کا
 اس پہ حالی اور ہم اترائیں کیا
 موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے ۶

آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا
 بے نیازی حد سے گزری کب تک
 ہم کہیں حال اور وہ فرمائیں ”کیا؟“ ۷
 فرشِ رہِ ناصح ہیں اپنے چشم و دل ۸
 ہم مگر کیا سمجھیں ، وہ سمجھائیں کیا
 جب میں جاؤں باندھ کر تنق و کفن ۹
 عذر میرے قتل میں وہ لائیں کیا
 ہے یہاں قحطِ غم الفتِ اسد ۱۰
 ہم جو دلی میں رہیں تو کھائیں کیا
 لطفِ حیر نیم کش کو دل سے پوچھ ۱۱
 پار ہو تو یہ خلش ہم پائیں کیا
 اس نے جڑ دی پہلے ہی آکر چھڑی ۱۲
 پیٹھ اپنی مصطفیٰ سہلائیں کیا
 الغرض یہ ہے غزل کی کائنات
 آپ سنتے ہم سناتے جائیں کیا
 شاعرانِ عہدِ پارینہ پہ ہم
 تیر طعن و طنز کے برسائیں کیا
 طاقِ نسیاں کا ہو گلدستہ غزل
 اور مصرف میں اسے ہم لائیں کیا
 لکھ کے رندانہ مضامین بار بار
 فعلۂ نفس و ہوس بھڑکائیں کیا
 اصل میں حالی کا مقصد تھا یہی
 جو نہ سمجھیں ان کو ہم سمجھائیں کیا
 لفظ ہے گو ”بیرونی مغربی“
 بات ہے سلجھی ہوئی ابھائیں کیا

باطنِ مفہوم پر بھی ہو نگاہ
ظاہر الفاظ ہی پر جائیں کیا
سہو سے لکھ دی جو ترکیب غلط
روح کو حالی کی اب شرمائیں کیا
مغربی شاعر نہیں ان کی مراد
پیروی پر اس کی حجت لائیں کیا
ہے تصوف اس کا موضوع - خن
اس سے اصلاح خن فرمائیں کیا
اس کا توجید وجودی ہے شعار ۳
فیض اس سے شاعری میں پائیں کیا
ہے تصوف راگنی بے وقت کی
وقت گزرے پچھ اس کو دہرائیں کیا
جانتے تھے حالی اس کو بے اثر
عصر نو کے اس سے دل گرمائیں کیا
خود نہ لکھیں ہم سے لکھنے کو کہیں
ہو کے عالم بے عمل کہلائیں کیا
مغربی شاعر میں کچھ ہو تو بھی خیر
”جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا“
پیروی کے قابل اس میں کچھ نہیں
ظرف خالی ہو تو پھر چھلائیں کیا
پیروی نظمِ مغرب کے خلاف
سب غلط ہیں تبصرے کیا رائیں کیا
اٹھ چلی مغرب سے آندھی زور کی
شعر پر مشرق کے بادل چھائیں کیا
”آفتاب آمد دلیلِ آفتاب“

اس صداقت کو جھٹلائیں کیا
پوچھتے ہیں کتنے دو اور دو ہوئے؟
”کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا“
قادری گو فیصلہ مشکل نہیں
راہ پر تیری مگر سب آئیں کیا
شبلی و خیام اس چکر میں ہیں
”ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا“



۱۔ غالب کا مطلع ہے:

بجور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
بیتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

۲۔ غالب کا شعر ہے:

عمر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

۳۔ مولانا حالی خود اپنے حالات میں لکھتے ہیں کہ پنجاب بک ڈپو میں چار سال تک انگریزی سے اردو ترجموں کی عبارت درست کی۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔

۴۔ حالی کے اس شعر سے ماخوذ ہے:

غزل میں وہ رنگت نہیں تیری حالی
الاچیں نہ بس آپ دھرت زیادہ

۵۔ حالی:

اب سنو حالی کے نوے عمر بھر
ہو چکا ہنگامہ مدح و غزل

۶۔ غالب کا شعر مجھ سے

۷۔ غالب:

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

۸۔ غالب:

حضرتِ تاجِ مر آئیں دیدہ و دل فرس راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

۹۔ غالب:-

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

۱۰۔ غالب:-

ہے اب اس معمورے میں قحطِ غم الفتِ اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

۱۱۔ غالب:-

کوئی میرے دل سے پوچھے تے ہر نیم کش کو
یہ غلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

۱۲۔ معنی:-

آیا جو کل لیے ہوئے وہ ہات میں چھڑی
آتے ہی جڑ دی پہلی ملاقات میں چھڑی

۱۳۔ یعنی وحدت الوجود۔

(حامد حسن قادری)

(خیام لاہور ۲۳ ستمبر ۱۹۳۶ء)

☆☆

تضمین منقبت

(برغزلی حضرت مولانا شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی قدس سرہ العزیز)

اے آنکھ دیکھ کعبہ ایمان اولیا

اے سر، یہ ہے درِ شہ شہان اولیا

اے جان، تو ہو اور غم جانان اولیا

اے دل بگیر دامن سلطان اولیا

یعنی حسین ابن علی جان اولیا

ہوتے اگر نہ سبطِ رسولِ خدا شہید

ملتی نہ عاشقوں کو فنا میں نشاطِ عید

ایسی شرابِ غم کی ہوئی تھی کہاں کشید

ذوقِ دگر بجامِ شہادت ازو رسید

شوقِ دگر ز مستی عرفان اولیا

اُن سے مزاجِ فقر میں شاہنشی کی خو

گلزارِ معرفت میں انھیں سے یہ رنگ و بو

کیا کہیے ان کا مرتبہ رفعت و علو

چوں صاحبِ مقام نبی و علی ست او

ہم فخرِ انبیا شدہ ہم جان اولیا

مستغرقِ خیالِ الہی ست ہمیش

ہم مظہرِ کمالِ الہی ست فطرتش

مجببہ جلالِ الہی ست سیرتش

آئینہ جمالِ الہی ست صورتش

زاں رو شد است قبلہ ایمان اولیا

حامد پلائیں جس کو شراب و لا حسین
 نکلے نہ اس کے سینے سے کیوں شور ”یا حسین“
 تو بھی نہ چھوڑ عشق شہ کربلا حسین
 دارد نیاز حشر خود امید با حسین
 با اولیاء ست حشر محبان اولیا

(اخبار دہ بدہ سکندری رامپور ۱۷ دسمبر ۱۹۳۵ء)

☆☆☆

جلوہ پُر نور

(اعلیٰ حضرت قبلہ عالم امیر ملت محدث علی پوری اور احفاد اہم کا معمول ہے کہ ہر سال مئی کے مہینے میں عرس شریف کے بعد کسی سرد مقام پر تشریف لے جاتے ہیں۔ اس سال مئی کے آغاز میں فریدی صاحب کی حیات میں جو اطلاعات علی پور شریف سے موصول ہوئیں ان سے معلوم ہوا کہ یاغستان (علاقہ غیر) اور کشمیر اور میسور سے لوگ آئے ہوئے ہیں اور حضرت کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ غالباً حضرت کشمیر یا کھیل (یاغستان) تشریف لے جائیں گے۔

اس عرصہ میں فریدی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اس حادثہ کے بعد علی پور شریف سے اطلاع ملی کہ حضرت شمال کی طرف کشمیر وغیرہ میں تشریف نہ لے جائیں گے بلکہ دکن کا عزم ہے۔ میسور تشریف لے جائیں گے۔ حضرت اس سے پہلے تعزیت نامہ میں فریدی صاحب کی فاتحہ خوانی کے لیے تشریف لانے کا ارادہ ظاہر فرما چکے تھے اس لیے میں نے قیاس کیا کہ عزم دکن اسی غرض سے فرمایا گیا ہے کہ آگرہ راستے میں آتا ہے۔ گرانڈ ٹرنک ایکسپریس جو دہلی سے سید حامد اس جاتا ہے لازماً آگرہ سے گزرتا ہے۔ فریدی صاحب کی حیات میں حضرت ہمیشہ سفر دکن سے مراجعت میں فریدی صاحب کے مکان پر قیام فرماتے رہے ہیں۔ اب فاتحہ خوانی کے لیے قدم رنج فرماتا ہے اس لیے کشمیر پر میسور کو ترجیح دی ہے۔ میں نے یہ مضمون ذہن میں رکھ کر ۲۹ جون کو یہ نظم لکھی اور حضرت کی خدمت میں ارسال کی۔ حضور نے بہت پسند فرمائی اور بار بار پڑھوا کر سنی۔

دل کھنچ رہا ہے جلوہ پُر نور کی طرف
 آنکھیں لگی ہوئی ہیں علی پُر کی طرف
 خوش ہیں غلام آگرہ بھی راستے میں ہے
 جب یہ سنا وہ جاتے ہیں میسور کی طرف
 قربان خستہ پائی و افسردہ خاطری
 وہ آ رہے ہیں بیکس و مجبور کی طرف
 در پردہ ہے فریدی مرحوم پر کرم
 بہر سفر دکن کی جو منظور کی طرف
 اُن کو بھی شوق دید تھا ایسا کہ کیا عجب

اُڑ کر گئی ہو روح علی پور کی طرف
قبلے میں اور قبلہ عالم میں فرق کیا
رخ اُن کا قبر میں ہے علی پور کی طرف
قربان جائے کہ توجہ حضور کی
جو پاس کی طرف ہے وہی دور کی طرف
پروا نہیں ہے کچھ مجھے مقدور ہو بہو
میری نظر ہے صاحب مقدور کی طرف
اب مجھ کو فکر کیا مری بگڑی بھی بن گئی
ان کی نگاہ ہے دل رنجور کی طرف
یہ فیض انہی کا ہے کہ جب اٹھی مری نظر
اخترا کی سمت تھی تو کبھی نور کی طرف
حیرت ہو یا نہ ہو وہی جلوہ تھا رو برو
دل سے نظر جو اٹھ کے گئی طور کی طرف
سجدے ہوں پائے قبلہ عالم پہ قادری
رکھنا ہے دھیان عشق کے دستور کی طرف

☆☆☆

- ۱۔ یعنی حضرت مولانا الحاج حافظ سید اختر حسین شاہ صاحب دامت برکاتہم جو اعلیٰ حضرت قبلہ عالم روحی
فداہم کے بڑے پوتے ہیں یعنی اعلیٰ حضرت کے بڑے صاحبزادہ صاحب قبلہ کے فرزند اکبر ہیں اور مستند عالم و
نفی و محدث ہیں اعلیٰ پایہ کے واعظ ہیں۔
- ۲۔ یعنی حضرت مولانا الحاج حافظ سید نور حسین شاہ صاحب قبلہ دامت برکاتہم جو اعلیٰ حضرت قبلہ عالم کے
فرزند اصغر ہیں۔ خود خلیفہ و صاحب اجازت ہیں۔ پنجاب و کشمیر بنگال و دکن وغیرہ میں ان کا فیضان ارشاد و ہدایت
جاری ہے۔ شاہانہ شان و شکوہ کے مالک ہیں۔

(مولانا مولوی حاجی حامد حسن قادری)

(دہلی سکندر ری راہپور ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۵ء)

☆☆☆

سلام پہنچے

(۱۲ شعبان المعظم ۱۳۶۴ھ (۲۳ جولائی ۱۹۴۵ء) کو اعلیٰ حضرت قبلہ عالم امیر ملت شہنشاہ علی پوری
دامت برکاتہم پنجاب سے میسور تشریف لے جاتے ہوئے آگرہ سے گزرے۔ دہلی سے میسور ریل گاڑی میں
سیٹ ریز روہنے کے سبب اس وقت آگرہ میں قیام نہ فرما سکے۔ بعد عید واپسی میں فریدی صاحب مرحوم کی فاتحہ
خوانی کے لیے قیام فرمانے کا وعدہ فرمایا۔ اتفاق سے حضرت کے ایک محبوب خادم حافظ نور احمد صاحب قصوری آگرہ
آ رہے تھے اور قصور کے اسٹیشن سے حضرت کے ہمراہ آگرہ تک آئے انھوں نے بیان کیا کہ حضرت نے قصور پر
اور پھر دہلی میں اور پھر مٹھرا کے اسٹیشن پر ان سے بار بار تاکید فرمائی کہ آگرہ چارہ ہو تو فریدی صاحب کے مزار پر
ضرور جانا اور میرا سلام بھی کہنا۔ حضرت قبلہ عالم کی اس یاد فرمائی اور توجہ خاص کون کر میرے دل پر خاص اثر ہوا
اتفاق سے ۱۴ شعبان کو فریدی صاحب کے یاران طریقت نے یہ تجویز کی کہ شب برات ان کے مزار پر جا کر گزاری
جائے چنانچہ بہت سے پیر بھائی اور اہل خاندان مزار پر شب بیدار رہے۔ صبح کے قریب وہاں کچھ ترشح بھی ہوا
۔ عجیب کیفیت رہی میں نے اسی روز یہ لکھ لکھی تھی جو مزار پر پڑھی گئی۔ بعض اشعار کا بعد کو اضافہ کیا، حضرت قبلہ عالم
کے سلام فرمانے کے تاثر سے یہ ردیف و قافیہ بن میں آیا تھا۔)

مرقد میں رحمت حق تم کو دمام پہنچے
دن اور رات پہنچے صبح اور شام پہنچے
آئے ہیں لے کے حافظ نور احمد قصوری
حضرت کا اے فریدی تم کو سلام پہنچے
مولے کے دل میں ہر دم بندے کی یاد ایسی
اس عزت و شرف کو تم لا کلام پہنچے
اس درجہ فنا تک جو تم کو عشق میں تھا
پہنچیں تو خاص پہنچیں کیا کوئی عام پہنچے
خدمت میں ان کی پہنچے پہنچے ہیں جو خدا تک
تم معرفت میں آخر تا اوج بام پہنچے

جلوہ نیر اعظم

(اعلیٰ حضرت امیر ملت قبلہ عالم شہنشاہ علی پوری دامت برکاتہم و ارواحنا فدا ہم آخر رمضان المبارک میں مراجعت وطن کے وقت میسور سے حیدرآباد تشریف لے گئے اور اپنے خلیفہ خاص و محب با اخلاص قاری شہاب الدین صاحب کے مکان واقع بیگم بازار میں فرودکش ہوئے۔ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم حضور نظام دکن خلد اللہ شمسہ و سلطنتہ کو حضور قبلہ عالم سے خاص ارادت و عقیدت ہے۔ جب حضرت حیدرآباد تشریف لے جاتے ہیں کہیں قیام فرمائیں حضور نظام حضرت کو اپنا مہمان سمجھتے ہیں اور روز بلا ناغہ اپنے خاصہ کا کھانا نہایت اہتمام سے سر بہر خوان میں خدام خاص کے ہاتھ موٹر کار میں حضرت قبلہ عالم کے لیے بھیجتے ہیں۔ حضرت سے ملاقات فرماتے ہیں حضرت کے واعظ میں تشریف لاتے ہیں۔ حضرت بھی اس عقیدت و محبت کی بڑی قدر فرماتے ہیں ہمیشہ حضور نظام کو تحائف دیتے ہیں اور جب موقع ملتا ہے علی پور تشریف سے حیدرآباد تھے بھیجتے رہتے ہیں۔ اس مرتبہ حضرت قبلہ عالم کی طبیعت ناساز تھی اس لیے دو تین روز سے زیادہ قیام کا ارادہ نہ تھا۔ ۳۰ اگست کو شب میں حیدرآباد پہنچے تھے۔ ۲ ستمبر کو روانہ ہونے کا قصد تھا۔ ہم کو اگرہ اطلاع فرمادی تھی کہ ۵ ستمبر کو اگرہ تشریف لائیں گے لیکن پھر اطلاع آئی کہ حضور نظام نے حضرت کو روک لیا کہ رمضان شریف کا آخری ہفتہ یہیں گزار کر عید کر کے مراجعت فرمائیں۔ حیدرآباد میں ۲۹ کے چاند سے ۲۸ ستمبر شنبہ کو عید ہوئی۔ حضرت اتوار کو حیدرآباد سے روانہ ہو کر منگل کو صبح ۷ بجے گرائڈ ٹریک ایکسپریس سے جلوہ فرمائے اگرہ ہوئے اور حسب عادت پروفیسر عابد حسن صاحب فریدی کے مکان پر قیام فرمایا۔ ان کی تعزیت و فاتحہ خوانی کے لیے ہی تشریف لائے تھے۔ شام کو فریدی صاحب مرحوم کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے تشریف لے گئے۔ حضور کے چھوٹے صاحبزادے حافظ سید نور حسین شاہ صاحب قبلہ دامت برکاتہم بھی ہمراہ تھے۔ فاتحہ کے بعد یہ نظم پڑھی گئی جو میں نے اسی موقع کے لیے کہی تھی:)

جلوہ گر ہیں قبلہ عالم تمہارے سامنے
ضوئیں ہے نیر اعظم تمہارے سامنے
تھا فریدی تم کو پا بوسی کا کتنا اشتیاق
لو کھڑے ہیں قبلہ عالم تمہارے سامنے

ملتے ہیں جو مراتب فیضان اولیا سے
کیا منکروں کا واں تک سودائے خام پہنچے
سیکھیں خلوص و ایثار آ کر ان اولیاء سے
خوشنودی خدا تک اس وقت کام پہنچے
فصل خدا و فیض مرشد نہ ہو جو شامل
تا نفس سرکش اپنی کیا روک تھام پہنچے
ہے مرقد فریدی پر نور و عطر آگئیں
رحمت کا ہر فرشتہ لے کر پیام پہنچے
در خلد کا کھلا ہو یا رب لحد کے اندر
جنت سے ان کی خاطر کوثر کا جام پہنچے
جو آج آکے برسا ہر روز نور برے
یہ سلسلہ یونہی تا روز قیام پہنچے
ہیں جمع پیر بھائی اور ہے شب برات آج
ان کی دعائیں پہنچیں ان کا سلام پہنچے
تعمیر مقبرہ میں یاروں نے کی جو محنت
انجمنیروں کا واں تک کیا اہتمام پہنچے
حضرت بھی آکے دیکھیں اور دیکھ کر دعا دیں
تعمیر مقبرہ جب تا اختتام پہنچے
مہدی و فائق اس کا اجر عظیم پائیں
اوج رضائے حق تک ان کا مقام پہنچے
فہرست خاصگاں جب ہونے لگے مرتب
لکھنے کو اس میں یا رب میرا بھی نام پہنچے
اے قبلہ دو عالم ہو لطف قادری پر
وقت آئے اور لحد میں جب یہ غلام پہنچے

(اخبار دہ بدہ سکندری راپور ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۵ء)

ہیں تمہارے میہماں شایبہ دنیا و دیں
اب سلاطین کا ہے رتبہ کم تمہارے سامنے
نور سے ان کے تمہارے دل نے پائی ہے جلا
کیوں نہ ہو بے قدر جام جم تمہارے سامنے
حضرت نور حسین آئے ہیں ہمراہ حضور
ہے فریدی نور کا عالم تمہارے سامنے
ہے تمہاری انجمن برپا تمہاری قبر پر
ہیں تمہارے یار اور ہمد تمہارے سامنے
میں بھی سب کے ساتھ ہوں دل پر غم لیے
میں بھی ہوں با دیدہ پر غم تمہارے سامنے
حال اپنا اس بھری محفل [میں اب میں] کیا کہوں
میں کہا کرتا تھا اپنا غم تمہارے سامنے
تم نے کی جانے میں جلدی ورنہ یہ تھی آرزو
پاس ہو تم اور نکلے دم تمہارے سامنے
پردہ ظاہر ہے یہ جو کچھ ہے ورنہ سچ یہ ہے
تم ہمارے سامنے ہو ہم تمہارے سامنے
کر رہے ہیں طاہر و زاہد ادا خدمت کا حق
خدمتیں شخصیں ان کی کیا کچھ کم تمہارے سامنے
ہیں تمہارے پیر بھائی اب بھی ویسے ہی شفیق
ان کی شفقت کا تھا جو عالم تمہارے سامنے
اب بھی ویسی ہی نظر حضرت کے حلقے پر رہی
جس طرح سے فیض تھا قائم تمہارے سامنے
ہاتھ حضرت نے اٹھائے ہیں دعا کے واسطے
اڑ رہا ہے نور کا پرچم تمہارے سامنے
رحمتیں نازل رہیں ہر دم تمہاری روح پر
جلوے نور خدا ہر دم تمہارے سامنے

فیض قلب قبلہ عالم تمہارے قلب پر
نور روئے قبلہ عالم تمہارے سامنے
قادری ویسا ہی حضرت کی توجہ سے رہے
جیسا تھا بے فکر اور بے غم تمہارے سامنے
☆☆☆

۱۔ مولانا مولوی محمد طاہر صاحب فاروقی ایم۔ اے پروفیسر و صدر شعبہ فارسی و اردو آگرہ کالج برادر عم زاد فریدی
صاحب مرحوم ان کی علالت اور وفات کے بعد وفات کے تمام دشوار کاموں کے ذمہ دار بنے رہے اور اب تک ہیں
جس کے سبب میں ہر تردد اور تنگ و دو سے آزاد رہا۔
۲۔ عزیز زہد حسن فریدی ایم۔ اے فرزند اکبر فریدی صاحب مرحوم نے اس صدمہ عظیم میں جتنی ہمت اور
صبر سے کام لیا فی الواقع حیرت ناک ہے اور ان کے والد مرحوم کا فیضان بھی ہے اور یادگار بھی مرحوم بھی عجیب عزم
و ہمت کے انسان تھے۔ (حامد حسن قادری)

(دہدہ سکندری رامپور ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۵ء)

☆☆

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ وَ تَعَالَى عَزَّ وَ جَلَّ

۱۳۶۳ھ

تربت معنبر

۱۳۶۳ھ

مولانا حاجی عابد حسن صاحب فریدی جماعتی نور اللہ

۱۹۳۵ھ

خلیفہ مجاز کعبہ دو جہاں قبلہ عالم علی پوری ارواحنا فدائہم

۱۹۳۵ھ

فی الحکمتِ خلدین فیہا

۱۳۶۳ھ

لَكَانَ عَيْشُهُ فِي الدُّنْيَا رَاحِيًا مُدَامَا

مُسَوِّدًا لِمَوَافَاتِ الْقُرْبَى الْعَابِدِ

۱۳۶۳ھ

عابد و شیخ ہادی عارف زاہدے صادق تقامرات

۱۳۶۳ھ

عابد پاک دل ہم اہل نظر بحر صدق و صفا مبارک ذات

۱۳۶۳ھ

آں فریدی فرد با اخلاص ناصر الدہر ' مجمع خیرات

۱۳۶۳ھ

سالكِ کامل فانی الشیخ قطب ربانی ارفع الدرجات

۱۳۶۳ھ

عاشق مصطفیٰ و رمز شناس روح عشاق مہبط برکات

۱۳۶۳ھ

آمدہ ہم ز عشق پیر شرف اشرف الناس کامل الحکمت

۱۳۶۳ھ

آفتاب منیر جن کا وقت

۱۳۶۳ھ

نور ارباب کشف جن کی رات

۱۳۶۳ھ

وہ بہار جہان سنت و شرع

۱۳۶۳ھ

وہ حق اسرار وہ فانی الذات

۱۳۶۳ھ + ۵۸۱

کون؟ وہ (جن کا دن شریعت نور)

۱۳۶۳ھ

کون؟ وہ (جن کے دن سے روشن رات)

۱۳۶۳ھ

کون؟ وہ بیحد میل چشمہ فیض

۱۳۶۳ھ

کون؟ وہ حق پرست پاک صفات

۱۳۶۳ھ

کرم و فہل صاحب لولاک

۱۳۶۳ھ

باد با جاہ ضامن بکات

۱۳۶۳ھ

پے نذر فریدی ممدوح

۱۳۶۳ھ

بہترین ہدیہ ہے سلام و صلوات

۱۳۶۳ھ

از قل العباد حامد حسن قادری نقش بندی جماعتی کان اللہ

۱۹۳۵ء

اس شعر میں فریدی صاحب مرحوم و مغفور کے چاروں فرزندوں کے نام آگئے ہیں جو بالترتیب عمر یہ ہیں۔ زاہد حسن۔ عارف حسن۔ صادق حسن۔ ہادی حسن۔

(اخبار ہدیہ سکندری ۱۲ اگست ۱۹۳۵ء)

☆☆☆

۱۔ مولانا عابد حسن فریدی مولانا صاحب کے برادر خورد سینٹ جانس کالج میں پروفیسر تھے۔ ۱۴ مئی ۱۹۳۵ء کو وفات پائی۔

۲۔ سورہ ہود۔ آیت نمبر ۱۰۸

۳۔ جب تک وہ زندہ رہا اس کی زندگی خوشگوار رہی۔ وفات کے بعد اس کی روح مغفور ہوئی۔ عابد فریدی کی وفات پر مورخ کہتا ہے۔ وہ صابر کی طرح جیا اور معصوم کی موت پائی۔

☆☆☆

قطعات تاریخ (۱)

(غوثیہ بی سکو بہت بہت دعا کیجیے۔ اور تاریخوں کی قدر افزائی کا بہت بہت شکر یہ اور یہ بھی کہ بطور عادت یا شوق یا خبط کے نہایت معمولی اور چھوٹے واقعات کی بھی تاریخیں کہتا رہا ہوں جن کو بے تکلف لوگوں کو سنایا تو جاسکتا ہے مگر اشاعت کے قابل نہیں ہوتیں اور آپ کے والد محترم کو لوگوں کی فضیحت میں مزہ آتا ہے۔ اخبار پڑھنے والے ہتے ہوں گے کہ بھلا ان واقعات کی تاریخیں کیا کہنی تھیں آپ پیشک سن سکتی ہیں۔ چند لطائف تاریخی لیجیے۔)

(۱) ایک کانپوری دوست اکثر آگرہ آتے ہیں وہ ماش کی دال کبھی نہیں کھاتے۔ ارہر کی دال مرغوب ہے۔ میں نے کہا ہم روٹیل کھنڈ والے تو ماش کے عاشق ہیں اور یہ تاریخ سنادی:

ماش را پرس از روٹیل کھنڈے
قدر نشاسد آں کہ غیر بود
دال آن خوردم و گفتم تاریخ

ماش الذال علی الخیر بود ۱۳۷۰ھ

(۲) چند دوستوں نے آگرہ آنے کا قصد کیا۔ سیر و تماشہ مقصود تھا اتفاق سے وہ زمانہ سیر و تماشا کے لیے نہایت ناموزوں تھا میں نے تار کے ذریعہ سے سفر ملتوی کرادیا اور یہ تاریخ لکھ بیٹھی:

سفر سے انھیں منع کرنا پڑا
کہ ایسی تمنا کا موقع نہیں
کبھی میں نے تاریخ بھی دے کے تار
کہ سیر و تماشا کا موقع نہیں

۱۳۷۰ھ

(۳) اب کے سارا سا دن تقریباً خشک گزر گیا۔ مگر آخری دن تک سلونو کا تہوار تھا یکا یک خوب بارش ہوگئی۔ خیال آیا سلونو بھی خشک نہیں ہوتے اسی لیے برسا ہے۔ اسی خیال سے

تاریخ نکل آئی:

جس تھا سخت پینا بے حد
ہوئی بارش تو وہ دونوں نہ رہے

سال فصلی نکل آیا کیا خوب
اجی اب خشک سلونو نہ رہے

۱۳۵۹ھ

(۴) ہمارے محلے کی مسجد میں چوری ہوگئی۔ سارق نے بڑی چالاکی سے کام لیا۔ میں نے

تاریخ کہہ دی:

یَسْرِقُ الْهَمَّالُ مِنْ بَيْتِ اللَّهِ
أَشْخَذُ أَتَهُ غُلَّے طغے
”بتواریخ سرکہ و سارق
سال گفتم بعبارت بلغا

۱۹۵۱ء

قادری اور بھی ہو اک تاریخ
اچھا دھوکا فریب - خوب دعا

۱۹۵۱ء

(اخبار بدہ سکندری رام پور ۲۷ جولائی ۱۹۵۱ء)

☆☆

غوثیہ بی مدیر اخبار بدہ سکندری کی صاحبزادی

قطعات تاریخ (۲)

(اگر چہ اب باسی سے باسی ہو گئی مگر عید مبارک!)

۲۹ رمضان المبارک کو چاند کی بڑی امید تھی مگر نظر نہ آیا اور ۳۰ روزے پورے کرنے پڑے۔
اس کی بڑی دلچسپ تاریخ ہوئی تھی۔
تاریخ

روزوں میں ہمیں ہیں سب سے افضل
کیا کوئی ہماری کر سکے ریں
تاریخ ہے قادری یہ کیا خوب
”تیس ایک ہمارے سب کے انتیس“

۱۳۷۰ھ

(دیگر)

تاریخ میں ہو قادری اظہار فضل رب
شکر خدا جو ہو گئے روزے تمام سب

۱۹۵۱ء

ایضاً

عید آئی روزے ختم ہوئے
پانی پایا اترا موزہ
یہ سال عیسوی اچھا ہے
”سب ختم ترواح و روزہ“

۱۹۵۱ء

(ایک تاریخ صرف آپ کو سناتا ہوں۔ اعلان کرنا نہیں چاہتا: میں اس تاریخ کو اس لیے چھپا کر نہیں رکھتا کہ بٹے کئے مسلمان شرمائیں۔)

تلاوت کی توفیق روزوں کے ساتھ
یہ بس رحمت حق کا ہے فیض عام
یہ تاریخ بھی ہو گئی قادری
ہوئے تین قرآن پیہم تمام

۱۳۷۰ھ

عید کی تاریخ

خوش کیوں روزہ داروں کو نہ ہو آج
بڑی رحمت بڑا انعام ہے عید
پیام تہنیت تاریخ میں ہے
”مبارکباد“ فیض عام ہے عید

۱۳۷۰ھ

(آپ کہیں گے یہ شخص تاریخ گوئی سے سوا اور کوئی بھی دین و دنیا کا کام کرتا ہے؟ ایک جدید تاریخ اور یاد آگئی۔ اب کے امتحان ایم اے میں کالج کے ایک عزیز طالب علم تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوئے۔ امید اس سے بہتر کی تھی۔ بڑے مایوس ہوئے۔ میں نے کہا:)

کیا فکر جو تھرڈ ہے ڈویژن
بیکار بھنویں نہ تاپے آپ
کہئے غسٹہ لائے
والو تر کا فیض مایے آپ
سن لیجئے قادری کی تاریخ
ثابت بالخیر جائے آپ

۱۹۵۱ء

(ایک اور لیجیے ۲۹ رمضان کو دو صاحبوں میں رنجش کے بعد صلح ہوگئی:)

نہ وہ غیر ہیں اور نہ کچھ یہ ہیں غیر
تو پھر اس قدر کیوں ہے آپس میں بیر
صلاح ان کو دینی تھی تاریخ میں
کہا: ”کر بھی لو صلح، الصلح خیر“

۱۳۷۰ء

☆☆

شفایابی غوثیہ بی پراظہار مسرت

(اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ آج ہی صبح گرامی نامہ نے صادر ہو کر شرف اعزاز بخشا۔ صاحبزادی غوثیہ بی
سلمہا کی علالت و صحت دونوں ہی ساتھ تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے بڑا فضل فرمایا۔ بڑی مسرت ہوئی۔ بہت بہت مبارک
ہو۔ اللہ تعالیٰ ان کو اور آپ کی اولاد کو آپ کے سایہ شفقت میں سلامت رکھے۔
یہ خط شروع کرنے کے بعد ابھی ایک بے تکلف تاریخ ہوگئی۔ وہ سن لیجیے۔)

قطعہ تاریخ

نہ کیوں غوث خود نام کی لاج رکھتے
کہا ان سے جب غوثیہ کو سنبھالو
سنا قادری نے جو صحت کا مرادہ
تو فوراً کہا ”غوثیہ بی شفا لو“

۱۹۵۰ء

(اخبار بدیع سکندری راپور یکم جنوری ۱۹۵۱ء)

☆☆

برابر اپنے اوپر پانی چھڑکواتے تھے پکھیا پانی میں بھگو کر جھلواتے تھے۔ فرماتے تھے کہ شرابور کردو۔ ڈاکٹر اور حکیم اس عمل سے پریشان تھے کہ کہیں درد یا درم نہ ہو جائے، نمونیہ کا اثر نہ ہو جائے۔ ڈاکٹر پانی چھڑکنے کو منع کرتے تھے لیکن فریدی صاحب فرماتے کہ کچھ نقصان نہ ہوگا۔ برابر پانی چھڑکتے رہو۔ چنانچہ دن رات پانی چھڑکاؤ اور پکھیا جھل جاتا تھا۔ ڈاکٹر حیران تھے کہ یہ کیا کیفیت ہے کہ بخار تیز نہیں مرض میں کوئی پیچیدگی نہیں پھرتا تھے ضعف اور اس قدر گرمی کا کیا سبب لیکن باوجود شب و روز بدن پر پانی پڑنے کے کسی قسم کا کوئی درد دکھ نہیں ہوا۔ ڈاکٹر سید غلام مرتضیٰ صاحب نے دوسری مرتبہ دیکھ کر کہا کہ ان پر کوئی خاص مرض نہیں یہ جو کچھ کیفیت ہے یہ ان کا حال قائل ہے یہی بات مولانا سعادت اللہ صاحب قبلہ نے پہلی مرتبہ فرمائی تھی۔ مولانا صاحب حکیم روحانی کے ساتھ طیب جسمانی بھی ہیں۔ پہلے روز ۱۱ مئی جمعہ کو فریدی صاحب کی نبض اور حالت دیکھ کر فرمایا تھا کہ نبض اور دل کی حرکت بالکل درست ہے بجز ریاح کے کوئی مرض نظر نہیں آتا لیکن اس کا کیا علاج کہ یہ تو جانے کے لیے کربا نہ دھے ہوئے تیار بیٹھے ہیں اپنے دل کی طرف متوجہ ہیں، جسم کی طرف مطلق توجہ نہیں۔ اس عالم میں آئیں تو دوا یا غذا اثر کرے اور یہ بھی فرمایا کہ یہ بدن پر پانی ڈالوانا بھی اتباع سنت میں ہے اور کوئی سبب نہیں یہ جو کچھ فرمائیں وہ کرو پانی چھڑکنے سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ فریدی صاحب دل کی طرف تو ہر وقت متوجہ رہتے ہی تھے لیکن جس وقت اپنے سلسلہ کا مراقبہ شروع کرتے تھے تو بچکے کو روک دیتے تھے مولانا صاحب نے فریدی صاحب سے پوچھا کہ آپ کو کیا تکلیف ہے؟ کیسی طبیعت ہے؟ فریدی صاحب نے فرمایا کوئی تکلیف نہیں خدا کے فضل سے بالکل اچھا ہوں۔ مولانا صاحب نے فرمایا کہ میں اندرونی حالت نہیں پوچھتا وہ تو اچھی ہی ہے آپ کو جسمانی کیا تکلیف ہے؟ فرمایا وہ بھی بالکل اچھی ہے مجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں۔ ۱۳ مئی یکشنبہ کی شب میں تمام رات سب سے باتیں کرتے رہے اور فرمایا کہ رزق دینے والا پالنے والا تو کوئی اور ہے میں تو کھانے والا تھا یہی سمجھنا کہ ہم سب میں سے ایک کھانے والا کم ہو گیا ہے۔ (سب کے رنج و غم کا بہت خیال تھا ان کو مجھے ماہ پیشتر علم ہو گیا تھا لیکن سب سے پوشیدہ رکھا) تھوڑی دیر خاموش رہے پھر فرمایا کہ کیا بجا ہوگا؟ ان کی اہلیہ نے کہا تین بجے ہیں۔ فرمایا کہ ایک ایک دودو آدی جا کر نفل پڑھو آ پھر اہلیہ سے فرمایا کہ آج کیا دن ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہفتہ ہے۔ فرمایا اچھا پھر انگلیوں پر دن گئے اور فرمایا کہ بیچھے دن ہیں۔ یہ پانچ چھ دن خیر سے گزر جائیں۔ انہوں نے پوچھا کیا فرمایا آپ نے؟ فریدی صاحب نے فرمایا کہ میرے سفر کا دن جمعرات یا جمعہ کا دن ہوگا بہت صبر و سکون سے کام لینا۔ تاخیر نہ ہو تیاری میں جلدی

حضرت مولانا فریدی صاحب کی وفات

نہایت رنج و اندوہ کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ برادر عزیز الحاج مولانا عابد حسن صاحب فریدی ایم اے ایل ٹی، پروفیسر سینٹ جانسن کالج، آگرہ نے بیس روز کی علالت کے بعد ۱۶ مئی ۱۹۳۵ء (۳ جمادی الثانی ۱۳۶۴ھ) کو چہار شنبہ کا دن گزار کر شب پنجشنبہ میں ایک بجے وصال فرمایا۔ اٹالہ و اٹالہ راجون۔

فریدی صاحب مرحوم ۲۷ اپریل کو علیل ہوئے حوالی گردہ میں ریاچی درد اور پیشاب میں سوزش تھی اس کے ساتھ بخار ہو گیا۔ درد و سوزش زیادہ نہ تھی۔ خان بہادر ڈاکٹر سید غلام مرتضیٰ صاحب ریٹائرڈ سول سرجن نے بڑی توجہ اور ہمدردی کے ساتھ علاج کیا۔ سوزش و درد کی تکلیف دو تین روز میں بالکل رفع ہوئی لیکن بخار قائم رہا اور ضعف بڑھنے لگا جب ڈاکٹر صاحب دو چار روز بعد دوسری مرتبہ دیکھنے آئے تو ان کی تشخیص و تجویز سن کر فریدی صاحب نے فرمایا کہ آپ جو چاہیں کہیں میں تو اپنے لیے کچھ فیصلہ اور کر چکا ہوں یعنی فریدی صاحب شروع ہی میں سمجھ گئے تھے کہ یہ مرض الموت ہے چنانچہ ”ایک صاحب دل بزرگ مولانا مفتی سعادت اللہ صاحب اسرائیلی سنبھلی دامت برکاتہم کو اجیر شریف خط لکھ کر بلایا تھا کہ میں بیمار ہوں آپ تشریف لائیے۔ جب مولانا صاحب قبلہ اجیر شریف سے تشریف لائے تو فریدی صاحب نے ان سے فرمایا کہ میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ آپ میرے چچا مولانا محمد حسن صاحب فاروقی کے پاس بھی آخرت وقت آگرہ میں موجود تھے۔ علالت سے ایک ہفتہ میں بہت کمزور ہو گئے تھے لیکن دوا پانی اور ہر چیز کے پینے کے لیے اٹھانے بٹھانے پر اصرار کرتے۔ فرماتے تھے کہ لیٹے سے پانی پینے میں مزہ نہیں آتا۔ آخری دس بارہ روز میں گرمی آگ کی شکایت فرماتے تھے اور ہر وقت سینے میں آگ سی لگی ہوئی فرماتے۔ ذکر اور عشق اللہ کی آگ تھی۔ فرماتے تھے کہ یہ ہاتھ پاؤں سلگتی ہوئی لکڑیاں ہیں ان پر پانی ڈالو دھواں اٹھے گا۔ بار بار یہ شعر فرماتے

لگا کے برف میں ساقی صراحی مئے لا
جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا

کرنا خلاف شرع و سنت کوئی کام نہ ہو ہر وقت ذکر میں مشغول رہنا۔ اس وقت بھی خاموش ہو گئے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھول کر سب کو دیکھا اور فرمایا کیا وقت ہے؟ اہلیہ نے کہا چار بجے ہیں۔ فرمایا سب لوگ کہاں ہیں؟ سب کو بلاؤ وضو کر کے پاس آکر بیٹھیں درود شریف پڑھیں سب کو جلدی بلایا۔ وضو کر کے سب ان کے پاس بیٹھ گئے سب لوگ جلدی جلدی درود شریف پڑھو یہ وقت پھر نہیں آئے گا۔ جس کو جو دعا مانگنی ہو مانگ لے قبول ہوگی مجھے تو مانگنا نہیں ہے پھر فرمایا کہ نعت شریف پڑھو کسی لڑکے نے اعلیٰ حضرت مولانا رضا خاں صاحب بریلوی قدس سرہ العزیز کا قصیدہ نور

کیا بنا نام خدا اسرا کا دولہا نور کا

پڑھنا شروع کیا۔ یہ نظم فریدی صاحب کو بے حد پسند تھی اکثر سنا کرتے تھے۔ فریدی صاحب نے فرمایا کہ مجھے اٹھا کر بٹھاؤ۔ نعت شریف بیٹھ کر سنوں گا۔ دو آدمیوں کے سہارے سے پٹنگ پر بیٹھ گئے۔ ضعف کا یہ حال تھا کہ اپنے ارادہ سے بیٹھ نہیں سکتے تھے سہارا دینے والوں پر گرے ہوئے بیٹھے تھے۔ نعت شریف سن کر ایسی کیفیت ہوئی کہ بے اختیار رقت طاری ہو گئی اس سے ہاتھ پاؤں بانہوں پنڈلیوں تک بالکل سرد ہو گئے۔ تیمار دار اس حال سے بہت گھبرائے جلد جلد ہاتھ پیر کپڑے سے رگڑنے شروع کئے بڑی دیر میں کچھ گرمی آئی لڑکوں نے وہ قصیدہ مختصر کر کے منقطع پڑھ دیا تو فریدی صاحب نے فرمایا سلام پڑھو لڑکوں نے آواز ملا کر اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کا مقبول سلام ”مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام“ پڑھنا شروع کیا۔ اب یہ کیفیت تھی کہ فریدی صاحب کے گرد ان کے تمام خاندان کے لوگ پیہیاں لڑکے لڑکیاں بھانجے بھتیجے چھوٹے بڑے سب کھڑے تھے تقریباً بیس آدمی تھے جو کھڑے تھے پنکھا جھل رہے تھے یا ہاتھ پاؤں مل رہے تھے۔ فریدی صاحب نے فرمایا کہ گلاب چھڑکوان کی اہلیہ نے کہا گلاب نہیں ہے کیوڑہ ہے فرمایا کہ کیوڑہ ہی چھڑکوں اور گلاب پاش میں کیوڑہ بھر کر محفل پر چھڑکا گیا۔ فرمایا اگر بتیاں سلگاؤ وہ جلا کر سامنے رکھ دی گئیں۔ پھر فرمایا سب کے عطر لگاؤ میرے بھی عطر لگاؤ۔ ناک میں لگاؤ۔ گویا باقاعدہ میلاد شریف منعقد کر لیا۔ یہ دیکھ کر ان کی اہلیہ نے فوراً بازار سے مٹھائی منگائی۔ جب سلام ختم ہوا تو کسی نے کہا کہ دعا مانگیے۔ اس کے بعد تین روز تک برابر نعت شریف سنتے رہے۔ اسی روز ۹ بجے صبح کو مولانا حاجی آل حسن صاحب دامت برکاتہم تاج گنج شریف سے تشریف لائے۔ تیمار داروں سے فرمایا کہ فریدی صاحب کی روح بہت بلند پرواز لگی ہے۔ نہیں معلوم کیا چیز ہے جو ان کو روکے ہوئے ہے۔

فریدی صاحب اعلیٰ حضرت قبلہ عالم امیر ملت مرشدی الحاج حافظ سید پیر جماعت علی شاہ صاحب محدث علی پوری راجی فدا ہم کے بیس سال سے مرید اور چودہ سال سے خلیفہ تھے اگر وہ اور بیرون آگرہ فریدی صاحب کا فیضان بیعت اور ارشاد جاری تھا۔ ہر ہفتہ اتوار کے دن بعد مغرب اپنے مکان پر آگرہ کے یاران طریقت کو جمع کرتے تھے اور حلقہ نقشبندیہ مجددیہ میں بٹھا کر توجہ دیتے تھے۔ حلقہ کی اس قدر تاکید تھی کہ جب تعطیل وغیرہ کے دنوں میں فریدی صاحب آگرہ سے باہر ہوتے تھے تو اس وقت بھی ہر اتوار کو ان کے مکان پر حلقے کے لیے پیر بھائی جمع ہوتے تھے اور سب مل کر بیٹھتے تھے مراقبہ کرتے تھے اور حسب معمول حلقہ و نماز کے بعد چائے پی جاتی تھی اور پھر نعت خوانی ہوتی تھی۔ علالت کے دوران آگرہ چودہ خود حلقہ میں شریک نہ ہو سکے لیکن حلقہ برابر ہوتا رہا۔

اس روز ۱۲ مئی ۱۹۳۵ء یوم یک شنبہ کو بھی حلقہ ہوا حلقہ و نماز کے بعد فریدی صاحب نے فرمایا تھا کہ سب پیر بھائی نعت خوانی کے لیے میرے پاس اندر آئیں پھر باہر جا کر چائے پینیں چنانچہ زنانہ مکان میں پردہ ہو گیا اور سب یاران طریقت فریدی صاحب کے گرد جمع ہو گئے اور دیر تک نعت خوانی ہوتی رہی۔ میں نے اس ہفتہ میں ایک نظم لکھی تھی جس میں اس سال علی پور شریف کے عرس میں اپنے اور فریدی صاحب کے حاضر نہ ہو سکنے کی حسرت اور وہاں کے حالات و مناظر کی کیفیت دکھائی تھی وہ نظم جس کا عنوان حسرت دیدار ہے اس رات کو بھی پڑھی اور فریدی صاحب پر بے اختیار رقت طاری ہوئی (اس نظم کو مضمون کے آخر میں پیش کیا جا رہا ہے۔ مدیر)

نعت خوانی کے بعد لیٹے لیٹے مصافحہ کیا اور خدا حافظ خدا حافظ کہہ کر رخصت کیا۔ ۱۳ مئی ۱۹۳۵ء دو شنبہ و شنبہ کو بھی شب و روز نعت شریف سنتے رہے۔ ضعف برابر بڑھتا جاتا تھا بولنا دشوار تھا اکثر اشاروں سے بات کہتے تھے اور بولتے تھے تو نہایت آہستہ سے۔ اس پر بھی نعت خوانی کے وقت فرمائش کر کے خاص خاص غزلیں پڑھواتے تھے۔ غزل کا ایک شعر یا ایک مصرع پڑھ کر بتاتے تھے ۱۴ مئی دو شنبہ کو نعت خوانی ہو رہی تھی کہ فریدی صاحب نے فرمایا کہ ولادت شریف کا بیان غلام امام شہید صاحب کی کتاب میں سے پڑھو۔ کتاب آنے میں دیر ہوگی تو تقاضا شروع کیا کہ جلدی پڑھو۔ میں نے زبانی پڑھنا شروع کیا:

شہنشاہ اعظم تولد ہوئے

رسول مکرم تولد ہوئے

اتنے میں کتاب آئی میں نے یہ نظم تولد شریف پڑھی تو فرمایا کہ سلام پڑھو۔ مولانا غلام امام

صاحب کا سلام شروع کر دیا

السلام اے آفتاب داد و دیں

السلام اے انتخاب اولیں

سلام کافی طویل تھا فریدی صاحب سہارے سے بیٹھے ہوئے تھے بار بار خیال آتا تھا کہ ان کو بیٹھتے اور رقت و کیفیت سے تکلیف ہوگی اس لیے چند اشعار کے بعد سلام ختم کرنا چاہا کہ فریدی صاحب نے فرمایا اور پڑھو سلام کے بعد بہت طویل مناجات ہے جو شاعری اور تاثیر دونوں کے لحاظ سے عجیب و لا جواب ہے میں نے پڑھنی شروع کی اور گھر کے بچوں نے آوازیں ملائیں عجب سماں بندھ گیا۔ فریدی صاحب اس نظم کے یہ اشعار حلقہ میں اکثر پڑھا کرتے تھے:

سخت مشکل ہے کہ وقت جاں کنی
ہوتی شیطانوں کو فکر رہ زنی
کش کش میں یاں تو اپنی جان ہے
واں وہ دشمن در پئے ایمان ہے
ایسی مشکل میں خبر لیجے مری
سید عالم مدد کیجیے مری
اس گھڑی رحم آپ کا درکار ہے
گر کرم کیجیے تو بیڑا پار ہے

اس وقت بھی ان اشعار پر ان کو عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ ۱۵ مئی ۱۸۷۵ء شنبہ کو بھی باوجود شدت ضعف کے نعت کی فرمائش کرتے اور سنتے رہے۔ ۱۶ مئی چہار شنبہ کو صبح کے وقت تھوڑی سی دوا پی اور پیشاب کیا لیکن اس کے بعد سے دوا غذا دودھ پانی ہر چیز سے انکار کر دیا خاموش ہو گئے اور عالم فانی سے بالکل قطع نظر کر کے ہوا الباقی سے لو لگا دی۔ ضعف بھی پہلے سے بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے کوئی کچھ کہتا تھا تو اشارے سے اقرار یا انکار کر دیتے تھے۔ بہت ہوا تو ہاں نہیں اچھا کہہ دیا۔ تمام دن ایک دو گھنٹہ بھی پانی کے نہیں پئے نہ پیشاب کیا ہوش و حواس شام تک بالکل درست رہے۔ شام کے وقت کالج کے پرنسپل اور وائس پرنسپل مزاج پرسی کے لیے آئے میں نے فریدی صاحب سے پوچھا کہ ان کو یہاں بلا لوں فرمایا بلا لو۔ دونوں صاحب پاس آ کھڑے ہو گئے فریدی صاحب ان کو دیکھتے رہے لیکن طرفین نے کوئی کلام نہیں کیا آج دن بھر نعت خوانی کی بھی فرمائش نہیں کی۔ سہ پہر کو ان کے اہلیہ نے کہا آج نعت شریف نہیں سنی پڑھو اؤں

سنیے گا؟ تو اشارے سے اقرار کیا لڑکوں نے وہی اعلیٰ حضرت بریلوی کا قصیدہ نور شروع کیا چند شعر سننے کے بعد اشارے سے روک دیا اور آنکھیں بند کر کے دل کی طرف گردن جھکا لی۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ذکر الہی کے شوق اور توجہ اللہ کے غلبہ کی وجہ سے اب کچھ سننے کا تعلق بھی عالم اسباب سے باقی رکھنا نہیں چاہتے۔ اللہ اللہ آج پانی چھڑکنے اور پنکھا جھلنے کی بھی خواہش و فرمائش ختم ہوئی تیمار خود ہی برابر پنکھا جھلنے رہے اور پانی کے چھینٹے دیتے رہے۔ عشاء کے وقت سے فریدی صاحب نے سانس کی مخصوص حرکت کے ساتھ ذکر شروع کر دیا سانس کے نیچے جانے سے پلنگ پر حرکت محسوس ہوتی تھی یہ شغل اتنی دیر تک رہا کہ گھر والوں کو پریشانی ہوئی۔ اسی وقت لڑکوں کو شہر بھیجا اور وہ مولوی سعادت اللہ صاحب اور مولوی محمد طاہر صاحب فاروقی (برادر عم زاد فریدی صاحب) اور حکیم آغا شمس الحسن صاحب کو ساڑھے بارہ بجے شب کو لے کر آئے۔ فریدی صاحب کا ذکر شغل برابر جاری تھا ان صاحبوں کو آئے آدھ گھنٹہ ہوا ہوگا کہ وہ حرکت ذکر آہستہ ہوتی گئی اور دو مرتبہ تیزی سے ذکر کر کے جان بحق تسلیم کر دی:

قسمت مگر کہ کشتہ شمشیر عشق یافت

مرگے کہ زندگاں بدعا آرزو کنند

ان کے اہل و عیال نے ان کی تعمیل حکم اور اتباع شریعت کا یہ حیرت ناک اور عظیم الشان ثبوت دیا کہ ان کی اہلیہ پلنگ کے پاس تخت پر بیٹھ گئیں اور سب لڑکیوں سے لڑکوں سے کہا کہ قرآن شریف لے لو اور پڑھنا شروع کر دو چنانچہ تلاوت قرآن پاک ہی میں صبح کر دی گیارہ بجے دن جنازہ گھر سے نکلا اس وقت تک کسی نے آہ تک نہ کی جنازہ نکلنے کے بعد غش پر غش آئے۔

فریدی صاحب کا مکان آگرہ کی مغربی جانب شہر سے تقریباً ۳ میل کے فاصلہ پر ہے اس محلہ کے بعد آگرہ کی آبادی ختم ہے۔ انتقال کی خبر صبح سے پہلے نہ دی جاسکی۔ جنازہ کا وقت ۹ بجے مقرر کیا گیا تھا لیکن ان تین چار گھنٹوں ہی میں پیر بھائیوں نے کمال ہمت و محنت سے قریب و بعید میں خبر پہنچا دی اور دس بجے تک آگرہ کے گوشہ گوشہ سے لوگ آ گئے۔ نماز جنازہ کے وقت کالج کے پرنسپل وائس پرنسپل اور ہندو عیسائی پروفیسر جو آگرہ میں موجود تھے آ گئے۔ جنازہ کے بعد سب نے چہرہ دیکھا قبرستان مکان سے کسی قدر فاصلہ پر تھا کہ پونے دو گھنٹے میں جنازہ وہاں تک پہنچا۔ حضرت سیدنا امیر ابو العلا قادری چشتی قدس سرہ العزیز کی درگاہ شریف کے باہر سڑک کے مشرقی جانب کربلا کی زمین میں کربلا مینی کی اجازت سے دفن کیا۔ غسل میت کے وقت حضرت مولانا مفتی سعادت اللہ صاحب اسراٹکی دامت برکاتہم موجود تھے۔ جس وقت اوپر سے چادر

اتاری گئی تو فریدی صاحب کا چہرہ دیکھ کر مولانا صاحب بیتاب ہو گئے، بڑھے اور فریدی صاحب کی ٹھوڑی ہاتھ میں لے کر پیداشانی پر بوسہ دیا پھر اٹھ کر کھڑے ہوئے اور چہرہ پر نظر ڈال کر پھر جھکے اور اور پھر بوسے دیے اور بعد کو فرمایا کہ میں فریدی صاحب کو برسوں سے جانتا تھا لیکن یہ اپنا حال اس طرح [چھپائے؟] ہوئے تھے کہ کبھی یہ خیال بھی نہ ہوا کہ ایسے بلند مرتبہ پر پہنچے ہوئے ہیں اعلیٰ حضرت مرشدی و مولائی قبلۂ عالم شہنشاہ علی پوری روجی فداہم نے جو تعزیت نامہ کا خط ارسال فرمایا ہے اس میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ”مشعل لے کر ساری دنیا میں تلاش کرو تو فریدی صاحب جیسا متبرک وجود نہیں ملے گا۔“

اسی کرامت نامہ میں یہ بھی ارشاد عالی ہے کہ فقیر کی ناگوں میں طاقت آجائے تو ان کے مزار شریف پر حاضر ہوں گا۔ سبحان اللہ کیا الفاظ ہیں اور کس کے زبان قلم سے ہیں اور جس کے لیے ارشاد ہے اس کا کیا مرتبہ ہوگا۔ اللہ اکبر! سبحان اللہ و بحمدہ! اللھم اغفر لنا و موئینا جمعین۔

فریدی صاحب کے مراتب روحانی کی بلندی کا اندازہ ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے جس کا میں نے اب تک اظہار نہیں کیا تھا اس زمانے کا ذکر ہے جب فریدی صاحب کی عمر ۲۳-۲۴ سال کی ہوگی شادی نہیں ہوئی تھی، تعلیم پार ہے تھے ایک مرتبہ چچا صاحب مرحوم کے ساتھ ایک بزرگ شیخ کامل کی خدمت میں حاضر ہوئے جب فریدی صاحب اٹھ کر چلے آئے تو ان بزرگ نے چچا صاحب سے فرمایا کہ اس لڑکے کے دامن سے اللہ اللہ نکل رہا تھا یہ وہ زمانہ تھا کہ فریدی صاحب نے کسی سلسلے میں کسی شیخ سے کوئی ذکر شغل حاصل نہیں کیا تھا۔ گویا یہ کیفیت جو ان بزرگ کو محسوس ہوئی بالکل خدا داد اور ذاتی تھی۔ اس کے بعد جب دربار علی پور شریف کی غلامی کا شرف حاصل ہوا تو بلاشبہ شیخ کی اکسیر صحبت اور کیمیائے توجہ نے پارس بنادیا۔

حسرت دیدار

(وہ نظم بلیغ جس کا ذکر مضمون بالا میں ہے)

گھر بیٹھ ان کی بزم کا منظر نظر میں ہے
یاد ان کی دل میں ہے رخ انور نظر میں ہے
ہم آگرہ میں اور علی پور میں ہے یہ دل
وہ آستان نظر میں ہے وہ در نظر میں ہے

دربار نور قبلۂ عالم ہے سامنے
وہ روئے پاک نور کا پیکر نظر میں ہے
ہے شان باب رحمت حضرت نگاہ میں
اندر ہے جو ہجوم جو باہر نظر میں ہے
جو محو دید ہے وہ نظر ہے نگاہ میں
جو وقف آستانہ ہے وہ سر نظر میں ہے
پروانہ وار شیفۂ ہیں سب نگاہ میں
شمع جمال روئے منور نظر میں ہے
عشاق ہیں وہ رشک عنادل نگاہ میں
وہ روئے پاک رشک گل تر نظر میں ہے
پنجاب اور دکن کا ہے مجمع نگاہ میں
سارا ہجوم سندھ و پشاور نظر میں ہے
ارباب علم کی ہے وہ کثرت نگاہ میں
جلے کی شان عرس کا منظر نظر میں ہے
اہل دل و نظر کا ہے منظر نگاہ میں
للتا ہوا خزانہ گوہر نظر میں ہے
ارشاد مرشدی کا ہے عالم نگاہ میں
بہتا ہوا وہ چشمہ کوثر نظر میں ہے
محروم حاضری ہیں فریدی و قادری
لیکن وہ بزم نور سراسر نظر میں ہے
اے قادری حضور کا دامن نہ چھوڑنا
ایسا کوئی نہیں ہے جہاں بھر نظر میں ہے
کافی ہے قادری کے لیے اک نگاہ لطف
یہ وہ ہیں کیمیا کا اثر ہر نظر میں ہے

اَذْكُرُوا مَوْتَكُمْ بِالْخَيْرِ

۲۱/۲۸ فروری کے الفقیہ میں کسی کا ٹھنڈا واری صاحب کا مضمون شائع ہوا ہے۔ جس کا عنوان ہے ”بریلوی علمائے کرام جواب دیں۔“ اس مضمون میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ ۲۱/۲۸ جنوری کے الفقیہ میں جو فرمان مبارک اعلیٰ حضرت قبلہ عالم امیر ملت محدث علی پوری دامت برکاتہم کے قلم مبارک سے شائع ہوا ہے اس میں حضور قبلہ عالم ارواح افاضیہ نے سرسید احمد صاحب علی گڑھی کے نام کے ساتھ ہر جگہ رحمۃ اللہ علیہ کیوں تحریر فرمایا ہے۔ سرسید صاحب کو خیر و نیکی کے ساتھ یاد کرنے پر کاٹھیا واری مضمون نگار بہت برہم و برا فروختہ ہیں۔ میں اس کا جواب مختلف پہلوؤں سے پیش کرتا ہوں۔

حضرت قبلہ عالم دامت فیضہم نے فرمان مبارک میں تحریر فرمایا ہے کہ جب حضرت نے سرسید صاحب کو رحمۃ اللہ علیہ کہا تو تقریر ختم ہونے پر اسی جلسہ میں تین مولوی صاحبان حضرت کے گرد ہو گئے کہ آپ نے سرسید کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ کیوں فرمایا ہے اور کہا ہے کہ آپ نے سرسید صاحب کی تہذیب الاخلاق تو نہیں پڑھی۔ حضرت قبلہ عالم مدظلہم نے فرمایا کہ تہذیب الاخلاق تو نہیں پڑھی مگر ان کے دو شعر مجھ کو یاد آ گئے وہ آپ کو سناتا ہوں۔ جب یہ شعر سنائے تو تینوں مولوی صاحب ایسے دم بخود ہوئے کہ ان میں سانس ہی نہیں تھا۔ شعرا دل یہ تھا:

دل و جانم فدایت یا محمد
سر من خاک پایت یا محمد

دوسرا شعر:

خدا دارم دل بریاں ز عشق مصطفیٰ دارم
ندارد بیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

اب کاٹھیا واری صاحب سے یہ عرض ہے کہ اس جلسے کے تین مولوی صاحبان کو سرسید احمد صاحب کے یہ دو شعر سن کر اطمینان ہو گیا اور وہ قائل ہو گئے کہ ان اشعار کا کہنے والا بیشک مومن ہے اور اس کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ کہا جاسکتا ہے۔ تو پھر کاٹھیا واری صاحب کیوں نہیں مانتے اور کیوں قائل نہیں ہوتے؟ ان مولوی صاحبان کا خاموش اور دم بخود ہونا یہی معنی رکھتا ہے

اگر ان کو اطمینان نہ ہوتا تو وہ حضرت قبلہ عالم دامت برکاتہم سے ضرور کہتے کہ یہ دلیل کافی نہیں ہے۔ جب وہ مولوی صاحبان مان گئے تو آپ کیوں نہ مانیں۔ آپ علمائے کرام سے جواب مانگتے ہیں۔ وہ مولوی صاحبان علمائے کرام ہی میں سے تھے۔ علمائے کرام کا جواب آپ کو وہیں مل گیا۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ سرسید احمد صاحب کے دوسرے شعر میں اس اعتراض کا جواب موجود ہے۔ انہوں نے یہ شعر اس وقت کہا ہے جب ان پر کفر کے فتوے لگائے گئے ہیں۔ وہ اپنے کافر گروں کو جواب دیتے ہیں کہ میں خدا رکھتا ہوں اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی آتش محبت اپنے دل میں رکھتا ہوں اس پر بھی تم مجھے کافر کہتے ہو۔ کافر کے پاس تو یہ ساز و سامان نہیں ہوتا جو میرے پاس ہے۔ کافر تو خدا و مصطفیٰ ﷺ سے محبت نہیں کرتا۔ اس میں شک ہے کہ سرسید صاحب اپنے اسلام و ایمان میں شک کرنے والوں کو یہ جواب دیتے ہیں اور صرف اقرار تو حید و رسالت نہیں کرتے بلکہ اس سے بڑھ کر عشق و محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اب غور فرمائیے کہ کوئی مسلمان اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہے۔ کسی کے ایمان کا اس سے بڑھ کر ثبوت کیا ہو سکتا ہے۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ حضرت امیر ملت قبلہ عالم دامت برکاتہم نے اپنے فرمان مبارک میں تحریر فرمایا ہے کہ آثار الصنادید میں سرسید صاحب لکھتے ہیں کہ میں حضرت شاہ غلام علی صاحب نقشبندی دہلوی کا مرید ہوں اس کی تصدیق سرسید صاحب کے ایک شعر سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے حضرت شاہ غلام علی صاحب قدس سرہ کی تعریف میں لکھا ہے اور جس کو مولانا خالی پانی پٹی نے سید صاحب کی سوانح عمری حیات جاوید میں نقل کیا ہے:

بمکتب رفتم و آموختم اسرار یزدانی
ز فیض نقشبند وقت جان جان جانی

”جان جاناں“ سے مراد حضرت میرزا مظہر اور ان کی جان حضرت شاہ غلام علی صاحب ہیں۔ اس شعر میں سرسید احمد صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت شاہ غلام علی صاحب خلیفہ حضرت میرزا مظہر جاناں رحمتہ اللہ علیہما جو اپنے زمانے کے قطب ہیں ان کے فیض سے اسرار یزدانی حاصل کیے۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ جو حدیث شریف میں نے عنوان میں لکھی ہے اس میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنے مرنے والوں کو خیر کے ساتھ یاد کرو۔ تو جو شخص اس خیر سے روکنے والا ہو اس کی صفت قرآن مجید کے الفاظ میں مَنَاعٌ لِلْخَيْرِ ہوئی۔

پانچواں جواب یہ ہے کہ اگر سرسید صاحب کے نام کے ساتھ مرحوم کا لفظ کہا جاتا تو جلسہ والے تینوں مولوی صاحبان کو اور کاٹھیاواری صاحب کو کسی قسم کا اعتراض نہ ہوتا۔ معمولی روزمرہ کی بات سمجھ کر خاموش رہتے۔ حالانکہ مرحوم اور رحمۃ اللہ علیہ دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے۔ دونوں دعائیہ کلمے ہیں۔ دونوں میں مرنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی دعا ہے۔ لہذا رحمۃ اللہ علیہ کہنے پر اعتراض کا کیا محل ہے۔

چھٹا جواب یہ ہے کہ سرسید صاحب کے لیے رحمۃ اللہ علیہ کا کلمہ اعلیٰ حضرت قبلہ عالم علی پوری ارواحنا فدائے ہم کی زبان مبارک سے نکلا ہے۔ یہ وہ مقدس و مبارک وجود اور یگانہ و یکتا ہستی ہیں کہ تمام عالم میں عرب و عجم میں ہندوستان کے طول و عرض میں کہیں ان کا نظیر نہیں ہے۔ یہ کوئی بات بے سوچے سمجھے نہیں کہہ دیتے۔ ہر کسی کے لیے ہر قسم کی دعا نہیں کر دیتے۔ یہ مقبول لہزہ دانی اور محبوب سبحانی ہیں۔ منزل البرکات اور مجیب الدعوات [کذا] ہیں۔ ان کی زبان مبارک سے جو نکلتا ہے وہی ہو جاتا ہے۔ انہوں نے سرسید صاحب کو رحمۃ اللہ علیہ فرمایا ہے۔ میرا ایمان یہ ہے کہ جس شخص کو یہ اپنی مبارک زبان سے رحمۃ اللہ علیہ فرماویں وہ اگر پہلے اس کا مستحق نہ تھا تو ان کے فرمانے سے ہو گیا۔

مکتبہ او گفنتہ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

(الفقیہ امرتسر۔ ۲۸۵۲۱ مارچ ۱۹۳۶ء)

☆☆

حیرت پر حیرت

الفقیہ مورخہ ۱۴/۷ جون میں میرے ایک مضمون کا جواب جناب ارشد قادری بلیاوی کی طرف سے بعنوان ”مقام حیرت“ شائع ہوا ہے لیکن مجھے ان کی حیرت پر حیرت ہے کہ ایک دانشمند آدمی لفظ و معنی، جسم و روح میں فرق نہیں کر سکتا۔ صرف بینائے ظاہر ہے باطن پر نظر نہیں رکھتا۔ میرے نزدیک ارشد صاحب کے طویل مقالے میں ضروری جواب طلب بات صرف ایک ہے جس کو ایڈیٹر صاحب الفقیہ خود میری جانب سے لکھ سکتے تھے۔ اس لیے کہ میں ان کو پہلے ہی لکھ چکا تھا، مگر وہ جان کر بھول گئے یا سو ہو گیا میں اس غلطی کے ازالہ کی خاطر یہ سطر لکھتا ہوں۔

میرے جس مضمون کا ارشد صاحب نے یہ جواب لکھا ہے اس کے جواب ششم میں میرے قلم سے ”مستجاب الدعوات“ کی جگہ ”مجیب الدعوات“ نکل گیا تھا۔ چونکہ میں نے اپنا مسودہ ہی الفقیہ میں اشاعت کے لیے بھیج دیا تھا میرے پاس اس کی نقل نہ تھی کہ بعد کو پڑھتا اور سہو قلم کا احساس ہوتا۔ چھپنے کے بعد جب دیکھا کہ مجیب الدعوات کا لفظ لکھ دیا ہے تو اسی دن میں نے ایڈیٹر صاحب الفقیہ کو یہ بات لکھ دی تھی کہ ”مجیب الدعوات“ کا لفظ بے محل قلم سے نکل گیا دوسروں کے ٹوکنے سے پہلے میں نے غلط فہمی کو رفع کرنا چاہا تھا۔

جناب ارشد قادری نے اپنے مضمون ”مقام حیرت“ میں میری اس غلطی کی گرفت کی ہے۔ ان سے گزارش ہے کہ آپ اس کو لغزش قلم تصور فرمائیں۔ ایڈیٹر صاحب الفقیہ کو گواہ کے طور پر پیش کرتا ہوں وہ اپنی شہادت وہیں حاشیہ پر ثبت فرمادیتے تو مجھے اس خامد فرسائی کی ضرورت نہ ہوتی۔ اس طرح کی غلطی بتقاضائے بشریت ہو جاتی ہے جیسی کہ آپ سے بھی اس مضمون میں سرزد ہو گئی ہے۔ آپ نے ”موجب رحمت“ اور ”موجب لعنت“ کے الفاظ کی جگہ لکھے ہیں۔ بعض مقامات پر آپ نے ”مستوجب“ کی جگہ ”موجب“ کا لفظ تحریر فرما دیا ہے۔ مثلاً صفحہ ۷ کے دوسرے کالم میں سطر ۱۲-۱۳ میں آپ نے لکھا ہے ”اس کو مومن اور موجب رحمۃ اللہ علیہ ثابت کرنے کے لیے“ یہاں ”مستوجب رحمت“ موزوں و بر محل تھا یعنی رحمۃ اللہ علیہ کا مستحق۔

آپ اپنے باقی جوابات و تبصرات کے جواب میں میری طرف سے ایک خندہ استہزاء قبول فرمائیں۔ اگر آپ کا مسلک مسلمانوں کو کافر ثابت کرنا ہے تو یہ آپ ہی کو مبارک رہے۔ آپ کے نزدیک سرسید کا کفر ان کو رحمۃ اللہ علیہ کہنے والا کافر ان کو کافر نہ کہنے والا کافر۔ تو بندہ خدا کسی کو مسلمان بھی رہنے دیتیجے گا یا نہیں۔ کافر گری کی یہی گرم بازاری ہے تو مولانا حالی کی وہ رباعی صادق آجائے گی جس میں وہ فرماتے ہیں:

شاید کہ قیامت میں ہو مومن سے سوال

تکفیر بھی کی تھی علما نے کہ نہیں

اگر آپ مسلمانوں کو کافر کہنے لگیں گے تو پھر کسی کا کافر بنایا جانا ہی تمغائے اسلام ہو جائے گا۔ گویا بقول سودا:

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی

چند روز کا واقعہ ہے کہ ایک عظیم الشان جلسے میں جہاں بڑے بڑے کافروں کا اجتماع تھا بعض اہل جلسہ نے مسلمانوں کے ایک بڑے لیڈر کو کافر ملعون مرتد کہا۔ لیکن ان میں سے کچھ اللہ والے بھی تھے۔ ایک ایسے ہی صاحب نے فرمایا کہ اس لیڈر کو کوئی کافر کہتا ہے کوئی مرتد کہتا ہے کوئی ملعون ٹھہراتا ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ وہ لیڈر ”ولی اللہ“ ہے۔ آپ لوگ اپنی رائے سے کہتے ہیں لیکن میں قرآن وحدیث کی رو سے کہتا ہوں اور انہوں نے یہ آیت پڑھی: اِنَّ السَّالِفِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلَ الصَّالِحٰتِ سَبَّحُوْا لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وَاِذَا (جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت پیدا کر دیتا ہے)۔ اس لیڈر کی محبت جو ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کے دل میں ہے یہ اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ ابھی وہ صاحب اسی مضمون کی حدیث شریف جو پڑھنا چاہتے تھے نہ پڑھی تھی کہ ان کا اتنا کہنا اور آئیہ کریمہ کا پڑھنا ہی گویا ہم کا گولہ ہو گیا کہ ارباب جلسہ میں شور برپا ہو گیا اور اٹھ اٹھ کر جانے لگے اس پر ایک شخص نے جلسہ کے ذمہ دار اصحاب سے کہا کہ آپ حضرات اس شدید گرم موسم میں ہزاروں میل کا سفر کر کے اور صد ہار پیہ صرف کر کے جمع ہوئے ہیں تو کس کام کے لیے؟ کیا مسلمان کو کافر بنانے کے لیے؟ آپ کا کام تو کافروں کو مسلمان بنانا ہے نہ مسلمان کو کافر قرار دینا۔

وہ صاحب اس آئیہ کریمہ کے بعد جو حدیث شریف سنانا چاہتے تھے وہ یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو اپنا مقبول بنا لیتا ہے تو فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ ساری دنیا میں آواز دے دو کہ ہم نے فلاں بندے کو مقبول بنا لیا ہے۔ فرشتے سب میں پکار دیتے

ہیں اور انسانوں کے دلوں میں اس کی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس جلسے کے لوگ اس لیڈر کو کافر مرتد کہا کریں اور سمجھا کریں۔ جو اس کو مسلمان اور مقبول الہی سمجھتا ہے وہ ایسا ہی کہتا ہے اور کہتا رہے گا۔ کوئی شخص کسی کے کافر کہنے سے کافر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح سرسید کو جو لوگ رحمۃ اللہ علیہ کا مستحق سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں اور بار بار کہتے ہیں اور ہمیشہ کہتے رہیں گے سرسید مسلمان ہیں سید ہیں حضرت شاہ غلام علی صاحب کے مرید ہیں۔ وہ خود اپنے آپ کو مسلمان کہتے رہے ساری دنیا عرب و عجم یورپ و امریکہ سرسید کو مسلمان سمجھتی اور کہتی رہی۔ تمام عمر سرسید نے کبھی بھولے سے بھی خدا اور رسول کی شان پاک میں بے ادبی نہیں کی۔ بلکہ نہایت ادب و احترام اور عشق و محبت ان کے صد ہا قول و افعال سے ثابت ہے۔ مولانا حالی کی ”حیات جاوید“ (سرسید کی سوانح عمری) پڑھیے۔ اور خدا اور رسول کے ساتھ ان کی والہانہ شیفٹگی کے واقعات و معاملات کے واردات و جذبات پڑھیے۔ مومن کے کمال ایمان کی پہچان حضرت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبت و گرویدگی ہے۔ سرسید کا یہ حال تھا کہ توہین کیا معنی سوء ادب کے ذرا سے اشارے کو بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ کسی کے قول و فعل میں حضور انور ﷺ کی ذات پاک کے ساتھ بے ادبی کا دانے شائبہ بھی ان کو نظر آ جاتا تھا تو بے تاب ہو جاتے تھے جوش آ جاتا تھا اور فوراً زبان سے یا تحریر میں جیسا موقع ہو اس گمراہی کو رفع کرتے تھے۔ مجھے سرسید کے حالات و واقعات یاد ہیں جن کی بنا پر یہ لکھ رہا ہوں۔ وہ باتیں لکھنے لگوں تو دفتر ہو جائے۔ آپ ایسی ہستی کو کافر و مرتد ٹھہراتے ہیں۔ یا للعجب:

ورد ہر رویے و آں ہم کافر

پس کیست کہ ورد ہر مسلمان باشد

کیا تماشا ہے۔ ”تم کہو گہرا سے گہرا مسلمان اس کو“ پھر دیکھیے کہ کیسے کیسے برگزیدہ لوگوں نے سرسید کو سراہا ہے۔ حضرت مولانا مولوی محمد عبداللہ صاحب ٹوکی مفتی اعظم نے لاہور کے ایک عظیم الشان جلسہ میں سرسید کی وفات کے بعد ان کی تعریف میں فرمایا تھا کہ تمام ہندوستان میں دوسو برس کی مدت میں کسی ملن مادر سے ایسا بچہ پیدا نہیں ہوا جس کو سرسید کے مثل قرار دیا جاسکے۔ اب آپ مفتی صاحب کے حق میں کیا فتویٰ دیں گے۔ آپ سرسید کو رحمۃ اللہ علیہ کہنے والے کو کافر بتاتے ہیں تو مفتی صاحب قدس سرہ العزیز کے اس ارشاد کے بابت کیا رائے قائم کریں گے۔ یہ ایک مثال ہے ایسے صد ہا اقوال درج کیے جاسکتے ہیں۔

جناب ارشد صاحب خدا سے ڈریے اس کو منہ دکھانا اور جواب دینا ہے۔ اس کافر گری کی

مشین کو بند کر کے رکھیے ورنہ اس کے شکنجے میں مسلمان کو کافر بنانے والے بھی آجائیں گے۔ آپ مجھ سے کیا کہتے ہیں۔ اپنی فکر کیجیے:

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرانی کیا پڑی اپنی نیر تو

(الفقیہ، امرتسر، ۱۳۲۷ جولائی ۱۹۳۶ء)

☆☆

حکیمانہ حکمت

۲۶ اگست کے دہدیہ سکندری میں حکیم محمد احمد صاحب علوی ناظم سنی کانفرنس نین پوری کا مقالہ پڑھا اور ان کی حکیمانہ ”حکمت“ پر بھی بقول ان کے پروفیسر انہ حیرت ہوئی اور اس بات پر افسوس ہوا کہ اب خلوص و صداقت اور صاف دلی و بے لوثی وہاں بھی نہیں پائی جاتی جہاں زیادہ سے زیادہ ہونے کی توقع تھی۔

میں نے اپنے جس مضمون میں جو کچھ لکھا، خواہ سرسید احمد خاں صاحب کے متعلق یا محمد علی جناح صاحب کی نسبت یا سنی کانفرنس کے بارے میں، اپنے علم و اطلاع سے لکھا، اپنے ایمان و اعتقاد کی بنیاد پر لکھا، بالکل خلوص و صداقت کے ساتھ لکھا اور بلا خوف و لومۃ لائم لکھا۔ میرا ضمیر بالکل صاف اور مطمئن ہے۔ مجھے اپنی کسی تحریر سے شرمندگی نہیں ہے اور کسی رائے سے بازگشت یا اعتذار کی ضرورت نہیں سمجھتا لیکن کیا حکیم محمد احمد صاحب بھی یہی الفاظ کہہ سکتے ہیں؟ اپنے اس فقرے کے متعلق جو انہوں نے میرے بارے میں تحریر فرمایا ہے ان کے الفاظ یہ ہیں:

”اہل سنت کو عام طور پر شبہ ہے کہ پروفیسر صاحب ازراہ پروفیسری ان بزرگ کے سابقہ ارشادات رد و ہابیہ دیوبندیہ سے دکھ پایا کرتے تھے اور تمنا رکھتے تھے کہ دیوبندیت کی مخالفت جاتی رہے، چنانچہ ایک موقع پا کر دیوبندی انداز بیان سے نام نہاد حمایت کر کے دریا کا رخ پھیر دینا چاہتے تھے۔“

لہذا بھتان عظیم! الحمد للہ کہ ان بزرگ پر میرا ظاہر و باطن سب روشن ہے اس لیے حکیم صاحب کی تحریر سے مجھے کوئی اندیشہ و تردد نہیں ہے۔ لیکن میں حکیم صاحب سے پوچھتا ہوں کہ کیا واقعی اہل سنت کو عام طور پر یہ شبہ ہے؟ بقول داغ ”تم نام تو لو بھلا کسی کا“ اگر حکیم صاحب نے یہ بات تصنیف نہیں فرمائی ہے تو ”یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی“ دیوبندی، نانوتوی، ایٹھوی، تھانوی وغیرہ کے متعلق جو کچھ میرا ایمان و اعتقاد اور طرز عمل ہے اس کا علم حکیم صاحب کو نہ ہو تو، باقی جو مجھے جانتا ہے اس بات کو بھی جانتا ہے۔ مجھے کسی صفائی کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں مگر حکیم صاحب کی حکمت اور پالیسی پر حیرت ہے کہ وہ بات لکھ دی جس کی ذرہ برابر حقیقت و اصلیت نہیں

اور جس کو وہ ثابت نہیں کر سکتے۔

میں حکیم صاحب کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ یہ امر خارج از امکان ہے کہ میرے متعلق اہل سنت کو عام طور پر یہ شبہ ہو۔ اہل سنت صرف نین پوری یا مراد آباد و رام پور بریلی میں نہیں بستے دوسرے اضلاع میں بھی ہیں جن کے شبہ کا علم حکیم صاحب سے زیادہ مجھے ہو سکتا ہے۔ پھر ”عام طور پر“ کہاں درست رہا۔ حکیم صاحب یقین رکھیں کہ جس شخص نے یہ پہلو اُن کو سمجھایا ہے وہ صاف دل اور صادق القول نہیں ہے اور جس وقت وہ یہ بات کہہ رہا تھا اس وقت بھی اس کو علم و یقین تھا کہ یہ بات خلاف واقعہ ہے اور اگر خود حکیم صاحب کے دل نے ہی ”یہ دکھ پانا“ اور ”تمنا رکھنا“ پیدا کیا ہے تو میرے تھمرے کو دل پر صادق سمجھیے۔

جن مباحث کے سبب حکیم صاحب نے یہ سب کچھ لکھا ہے ان کو میں تفصیل کے ساتھ چھیڑنا نہیں چاہتا۔ صرف ایک بات عرض کرتا ہوں کہ مولانا سلیمان اشرف نے اپنی کتاب النور میں جو ”سرسید کو“ ”مرحوم“ لکھا تھا اور اعتراض کے جواب میں فرمایا تھا کہ سرسید نے آخر زمانہ میں توبہ کر لی تھی اور اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب مجدد مآۃ حاضرہ قدس سرہ العزیز کو بھی سلیمان اشرف صاحب نے یہی جواب دیا تھا تو بالآخر وہ ”سرسید کو“ ”مرحوم“ لکھنے پر کس فتوے کے مستحق ٹھہرے تھے؟ اور مولانا سلیمان اشرف صاحب جیسا مسلمان اگر سرسید کے متعلق توبہ کی اطلاع دے تو ماننے کے قابل ہے یا نہیں؟ اور اس شہادت کے بعد بھی سرسید کو ”مرحوم“ یا ”رحمۃ اللہ علیہ“ کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟

(اخبار دہدہ سکندری رامپور ۶/۱۹۳۶ء)

☆☆

بنام مدیر ”دہدہ سکندری“ رامپور

حضرت محترم مجمع مکارم اخلاق مخلص زاد مجدکم۔ السلام وعلیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
طالب خیریت، بخیریت۔ امید مزاج گرامی مع الخیر ہوگا۔ آپ سے ملاقات کو تو سالہا سال گزر گئے خط و کتابت بھی مدت سے نہیں ہوئی۔ راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائیں کیوں۔ اس وقت تقریب تحریر یہ پیدا ہوئی کہ میرا چھوٹا لڑکا راشد حسن (عمر ۱۲ سال) دہدہ سکندری کو بڑے شوق سے پڑھتا ہے۔ اس میں بزرگوں کے حالات پڑھ کر اس کو بھی لکھنے کا شوق ہوا۔ دو چھوٹے چھوٹے مضمون لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ اگر پسند ہوں تو درج فرما کر اس کی حوصلہ افزائی اور مجھ کو ممنون فرمائیے۔

آپ اپنی محبت سے دہدہ سکندری خالد حسن کے نام برابر بھیجتے ہیں میں اس کرم کا شکریہ ادا کر ہی نہیں سکتا۔ اخبار کی قلمی خدمت کی بھی توفیق نہیں ہوتی ہر ہفتے اخبار آپ کی یاد تازہ کرتا ہے میں ہمیشہ بالا التزام اس کو دیکھتا ہوں سب بچے پڑھتے ہیں تمام پرانے اخباروں میں دہدہ سکندری کو میں سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔ مضامین کی نوعیت اور ترتیب سلامت روی اور خدمت اسلام کے لحاظ سے کوئی قدیم اخبار دہدہ سکندری سے بہتر نہیں ہے۔ بفضلہ تعالیٰ ہندوستان میں بعض اخبارات کو عمر دراز عطا ہوئی ہے جو خاندان صحافت کے بڑے بوڑھے کہے جاسکتے ہیں ان میں دہدہ سکندری سب سے بوڑھا نہ بھی ہو تو میرے نزدیک بقول شیخ سعدی ”بزرگی بعقل است نہ بہ سال“ سب سے بزرگ ہے۔ آپ جیسی استقامت کے ساتھ اپنی وضع کو نباہ رہے ہیں لائق تحسین ہے۔ بضحو اے الاستقامۃ فوق الکرامۃ۔ یہ بات لکھ کر ایک حکایت یاد آگئی کوئی شخص کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت سے شرف ہوا اور خدمت میں رہنے لگا۔ ایک سال گزرنے کے بعد اس نے اپنے شیخ سے باادب عرض کیا کہ حضور مجھے ایک سال خدمت میں رہتے گزر گیا لیکن کوئی کرامت نہیں دیکھی۔ ان بزرگ نے تبسم فرما کر پوچھا تم نے اس عرصے میں کوئی بات خلاف سنت دیکھی؟ مرید نے عرض کیا نہیں۔ بزرگ خاموش ہو گئے۔ بات آئی گئی ہوئی۔ ایک سال اور گزر گیا تو پھر اس مرید نے وہی سوال کیا کہ حضور سے کوئی کرامت نہیں دیکھی۔ پیر صاحب نے مسکرا کر پھر وہی سوال کیا کہ کوئی بات خلاف سنت تو نہیں دیکھی اور

مرید کا وہی جواب تھا کہ خلاف سنت کوئی عمل نظر نہیں آیا۔ پھر تیسرا سال گزرنے کے بعد جب مرید نے وہی سوال کیا اور شیخ نے وہی جواب دیا تو یکا یک مرید قدموں میں گر پڑا اور عرض کیا کہ حضور اب سمجھ میں آ گیا بیشک اتباع سنت خود کرامت ہے اس سے بڑھ کر کوئی کرامت نہیں۔ تو حضرت آپ اس طرح بھی صاحب کرامت ہیں جس کا تعین مجھے بے دیکھے ہے بلکہ بے دیکھے کیوں دیکھا ہے۔ اب کوئی پندرہ برس سے شاید نہیں دیکھا لیکن یہ جسکے پڑنے کے بعد چھوٹا نہیں یہ ملکہ راسخہ طبیعت سے نکل نہیں سکتا بلکہ اس سے باز گشت صوفی کے بس کی بات ہی نہیں رہتی۔ بقول شیخ سعدی:

من ازین باز نیایم کہ گرفتیم در پیش
اگر می رود از پیش دگر می نہ رود

اور بقول خواجہ حافظ:

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید
یا جاں رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

اور آپ دنیائے صحافت کی وضع داری میں بھی صاحب کرامت ہیں۔ اس میں تو میں ہر پختے کا شاہد یعنی ہوں۔ رامپور میں میرے لڑکپن اور جوانی کا زمانہ گزرا ہے۔ بقول کے ”گیسٹے پچپاں کی گلیاں ہیں مری چھانی ہوئی“ لیکن آج تک جب کہ پیری و ضعیفی سے ہاتھ میں رعشہ آ گیا ہے رامپور کی یاد دل سے نہیں نکلی۔ دبدبہ سکندری میں رامپور کی ایک ایک خبر بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ وہاں مقامی و ذاتی عزل و نصب سے کسی بے تعلق آدمی کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے لیکن حکام کی ترقی، رخصت و غیرہ کی خبریں بھی بڑے شوق سے پڑھتا ہوں حالانکہ حکام میں سے میں نے نہ کسی کو دیکھا نہ کسی سے شناسائی۔ اللہ ماشاء اللہ۔ یعنی کبھی اسکول کا ساتھی یا ملاقاتی نظر آ جاتا ہے۔ مثلاً ارشاد علی خاں یا میرے ہم وطن مولوی ناصر الدین سولنج، آپ کے تاجدار نواب صاحب رامپور کی تعریفیں میں بھی غیروں سے سنتا رہتا ہوں اور خوش ہوتا ہوں۔ ابھی چند روز ہوئے کسی بے تعلق لیکن باخبر شخص نے سنایا تھا کہ کسی ریاست کے سخت و سنگین مقدمے میں نواب صاحب رامپور نے ایسی بیدار مغزی کے ساتھ گورنمنٹ کے سامنے معاملہ کو سلجھایا کہ آخر نواب صاحب ہی کی رائے کے مطابق ریاست کے حق میں فیصلہ ہوا۔ باخبر حلقوں میں نواب صاحب کی ذہانت و اصابت رائے کی دھوم مچ گئی۔

میں بھی عجیب آدمی ہوں بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا لیکن ”لذیذ بود حکایت دراز تر گفتیم“

بلکہ ”ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے۔“

اس خط سے اگر آپ محظوظ ہوئے ہوں تو میں اس کے صلہ میں آپ سے دعائے خیر کا طالب ہوں۔ عمر اب بہت کم رہ گئی ہے خاتمہ خیر کی دعا فرمائیے۔ بھائی عابد حسن اور عزیز خاں خالد حسن سلام لکھواتے ہیں۔ والسلام۔

احقر حامد حسن قادری

(اخبار دبدبہ سکندری رامپور ۶ جولائی ۱۹۳۳ء)

☆☆

۱: فضل حسن صابری

بنام مدیر ”ہمدرد“ دہلی

۱۶ اپریل ۱۹۳۷ء

جناب مکرم صابر حسن صاحب قادری
السلام علیکم

عزیزی خالد حسن قادری سلمہ کے نام اخبار ہمدرد آیا۔ دبذب سکندری بھی اسی کے نام آتا ہے۔
اجرائے ”ہمدرد“ کی بڑی مسرت ہوئی۔ ہمدرد نام کی تحریر اور اس پر مسجد جامع کا نقشہ دیکھ کر
مولانا محمد علی مرحوم اور ان کا ہمدرد، اور ہمدرد کا دفتر کوچہ چیلان اور دفتر کے درو دیوار بدیہی نقشہ
آنکھوں میں پھر گیا۔

آپ کو علم ہے کہ ریاست رامپور سے میرے کتنے قدیم تعلقات ہیں۔ میرے عم مرحوم مولانا
محمد حسن صاحب فاروقی کے مولانا محمد علی صاحب سے بڑے بے تکلف مخلصانہ مراسم تھے۔ ان کے
ساتھ میں مولانا کے مکان پر بھی رامپور میں حاضر ہوا ہوں۔ پھر چچا صاحب ہی کے ارشاد سے دہلی
گیا تو ہمدرد کے دفتر میں جا کر مولانا محمد علی صاحب سے ملا اور چچا صاحب کا سلام و پیام پہنچایا۔
ہمدرد کو میں وقت اجراء سے برابر دیکھتا رہا۔ ۱۹۲۵ء میں میں نے انگریزی سے ایک مختصر افسانہ
ترجمہ کر کے ”آسمانی سوار“ کے نام سے لگا رکھنا میں چھپوایا تھا۔ (یہ فسانہ اب میرے
افسانوں کے مجموعہ ”صيد و صیاد“ میں شامل ہے) یہ افسانہ اپنے [.....] ایسا جدید و عجیب تھا کہ
مولانا محمد علی نے بہت پسند کیا۔ اور اپنے اخبار ”ہمدرد“ میں اس کو نقل کیا۔ حالانکہ ”ہمدرد“ میں
بالعموم افسانے شائع نہیں ہوتے تھے۔

مولانا محمد علی کے ریاست بڑودہ سے آنے کے بعد میں بڑودہ کالج میں ملازم ہو کر پہنچا اور چار
سال ان لوگوں کی صحبت میں رہا، جن سے مولانا مرحوم کے خاص تعلقات تھے۔ وہاں مجھے مولانا
محمد علی کے وہ حالات معلوم ہوئے جو آج تک ان کی بڑی سوانح عمریوں میں بھی نہیں آئے۔ ان میں
سے صرف ایک واقعہ مولانا محمد طاہر صاحب فاروقی ایم اے (صدر شعبہ فارسی وارڈو آگرہ کالج) نے
اپنی مختصر سیرت محمد علی میں درج کیا ہے۔ میں اس واقعہ کو مولانا محمد علی کی کرامت سمجھتا ہوں۔

ایک زمانے میں مولانا کا افسران کا بے سبب دشمن ہو گیا اور درپے اخراج رہنے لگا۔ جب
معاملہ انتہا کو پہنچ گیا اور دشمن نے مولانا کی معزولی کی تمام تدابیر مکمل کر لیں تو ایک دن مولانا بزم

احباب میں کچھ مغموم و متفکر نظر آئے۔ لوگوں نے سبب دریافت کیا۔ مولانا نے صورت حال بیان
کی اور دل پر درد سے یہ شعر پڑھا:

ندائم کہ سنگ سپہر قضا
ترا پیشتر بھگند یا مرا

دوسرے روز صبح کو سنا گیا کہ رات کو اس افسر نے یکا یک قضا کی۔

مولانا محمد علی طرافت کا مجسمہ اور شوخی کے پٹلے تھے۔ بڑودہ میں ان کے ایک سن رسیدہ دوست
نے پہلی بیوی کی زندگی میں دوسری شادی نو جوان دوشیزہ سے رچائی۔ جلسہ نکاح میں تو شوخی و
شرارت کا موقع نہ تھا مگر شب عروسی کی صبح کو بے تکلف احباب ایک دوست کے مکان پر جمع
ہوئے اور نئے نویلے دولہا کو بلا بھیجا۔ وہ آئے تو اس شان سے کہ ”مسی مالیدہ لب پر رنگ پان
ہے“ ریش خضابی اور لباس عروسی پر افشاں آنکھوں میں سرمہ زعفرانی صافہ باندھے ہوئے مولانا
نے دیکھتے ہی جلدی سے کمرے کے دروازے بند کر دیے اور بوڑھے دولہا کے سر پر سے رنگین
صافہ لے کر اپنے کوٹ پتلون پر ساڑی کی طرح لپیٹ لیا اور کمرے میں ناپنے اور سہراگانے لگے۔

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

آپ کے اخبار کے نام اور نقشے نے تصور کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے ہمدرد کو
کامیاب و مقبول فرمائے۔ آمین۔

احقر حامد حسن قادری

(ہفتہ وار ایڈیشن ہمدرد ”دہلی“ ۱۹ مئی ۱۹۳۷ء)

☆☆

تاریخ ہند منظوم

(مصنف جناب حاجی سید محمود علی صاحب یزدانی رامپوری منشی فاضل و مددگار مدرسہ فوقانیہ ہنگوئی، حیدرآباد دکن)

سید محمود علی صاحب ان ہستیوں میں ہیں جن پر ریاست رام پور کو بجا طور پر فخر ہو سکتا ہے لیکن سید صاحب غریب الوطنی کے سبب سے رام پور کی فضائے علم و ہنر اور دنیائے شعر و ادب میں شاید روشناس بھی نہیں کئے گئے [حیدرآباد] دکن سے رام پور آتے ہیں اور چند روز تعطیل کے گزار کر چلے جاتے ہیں۔ ذاتی کام فرصت نہیں دیتے کہ رام پور کی مجالس علم و ادب میں شریک ہوں، ان کا تمام خاندان رام پور میں سکونت گزیر ہے۔ حضرت سید بادشاہ میاں صاحب جعفری القادری اور آپ کے فرزند سید محسن صاحب حشر پیشکار (سرشدہ تعلیم) ساکن گھیر غلڑیاں حاجی محمود علی صاحب کے عزیز ہیں۔

محمود علی صاحب میرے ۳۵ سال پہلے کے ساتھیوں میں ہیں جب ہم دونوں مدرسہ عالیہ رام پور میں پڑھتے تھے درس نظامی کے فارغ التحصیل اور پنجاب کے امتحانات عربی و فارسی واردو کے سند یافتہ ہیں۔ ان کی طالب علمی کے زمانے کی ذہانت و قابلیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۱۱ء میں مدرسہ عالیہ جو اس وقت قدیم جامع مسجد میں تھا کالانہ جلسہ ہوا۔ مولانا فضل حق صاحب مرحوم پرنسپل تھے اور صاحبزادہ مصطفیٰ علی خاں صاحب ہوم سیکرٹری اور وزیر تعلیمات تھے۔ جامع مسجد کے دالان میں حکام و عمائدین ریاست اور اساتذہ و طلباء مدرسہ کا بڑا مجمع تھا۔ مختلف انعامات کے سلسلہ میں عربی زبان میں انشا پرداز کی کا بھی ایک مقابلہ تھا۔ اعلیٰ جماعت کے کئی طالب علم مقابلہ عربی میں شریک ہوئے۔ محمود علی صاحب نے دوسرے طلباء کے مضامین نثر کے مقابلہ میں اپنا مقالہ عربی قصیدہ کی صورت میں سنایا۔ مولانا فضل حق صاحب اور دیگر علماء نے بے حد تحسین کی اور محمود علی صاحب ہی کو انعام کا مستحق قرار دیا اور ایک اشرفی انعام دی گئی۔ حاجی محمود علی صاحب نہایت دل چسپ و دل کش شخصیت رکھتے ہیں طبیعت بڑی باغ و بہار ہے۔ ان کا فطری خاصہ ”تیزی اور جلدی“ ہے۔ تیز چلتے ہیں جلدی بولتے ہیں اور اس سے جلدی شعر کہتے ہیں۔ نظم میں باتیں کرنے کا شوق ہے بات بات کو مصرعوں میں موزوں کر دیتے ہیں۔ صد ہا

جلسوں اور تقریبوں میں نظمیں پڑھی ہیں اور مشاعروں کے لیے غزلیں کہی ہیں۔ اس شوق شاعری اور مشق نظم پر دازی کا بہت عجیب اور بالکل جدید نمونہ یہ ہے کہ محمود علی صاحب نے تاریخ ہند کو سراسر نظم میں ڈھال دیا ہے۔ یہ اتنا بڑا، ایسا مشکل اور اس قدر عجیب کارنامہ ہے کہ مجھے تو تصور سے بھی حیرت ہوتی ہے۔ تاریخ کی کتاب کو منظوم کر دینا شاعر کے کمال فن، کمال شغف اور کمال محنت کا شاہد عادل اور حجت ناطق ہے۔ مولوی محمود علی صاحب اس عظیم الشان خدمت اردو پر بے حد تحسین و تہنیت کے مستحق ہیں۔ خدا کرے ان کی تاریخ منظوم جلد طبع ہو کر مدارس میں رائج ہو جائے اور مقبول عام کی سند پائے۔

نمونے کے طور پر بعض مختلف حصے مختلف مقامات سے ناظرین و بدینہ سکندری کی ضیافت طبع کے لیے پیش کرتا ہوں:

علاؤ الدین خلجی
(فتح دکن)

منہک جیسا رہا خلجی شمال ہند میں
حال اس کے ابتدائے دور کا ہم کیا کہیں
رخ دکن کی سمت کرنے کی ملی نہیں مہلت
تھا دکن کی فتح کا لیکن خیال دل نشیں
دیو گری کے راجہ نے اس سے جو وعدہ کیا
وہ خراج و باج اس نے نہ کچھ اصلاً دیا
تیرہ سو سات عیسوی سن میں علاؤ الدین نے
راجہ پر حملے کی تیاری کی اک تدبیر سے
دیکھ اک لشکر دکن بھیجا ملک کافور کو
فتح کر ڈالے دکن کو آگے پھر جو ہو سو ہو

دیو گری پر کر لیا قبضہ ملک کافور نے اور مقید کر کے راجہ کو سمجھوں کے سامنے بادشہ کے پاس دہلی کو روانہ کر دیا ساتھ راجہ کے سلوک اس نے بہت اچھا کیا قدر کی اس کی خطاب رائے رایاں ہی دیا دل علاؤالدین کا انصاف سے خالی نہ تھا اس طرف کافور جب اس کام سے فارغ ہوا پھر تلنگانہ پر حملے کا ارادہ کر دیا ڈر کے راجہ نے ورنگل کے اطاعت کی قبول اس طرح کافور کے دل کا ہوا مقصد حصول

فتح کر ڈالے علاقے سب جنوبی ہند کے اور لیا پھر باج کر نانک سے' مالا بار سے سکہ دہلی کا بٹھایا یوں جنوبی ہند پر تھا تدبیر بھی ملک کافور کا کیا کارگر مال و زر لے کر شمالی ہند کو واپس ہوا تیرہ سو گیارہ کا سن عیسوی اس وقت تھا حکم خالق سے جنوبی ہند کی ساری زمین یوں علاؤالدین خلجی کے ہوئی زیر نگین

انتظام دکن

خلجی نے پھر سلطنت توسیع کرنے کے سوا ملک کے نظم و نسق کا کام بھی اچھا کیا

کیسے کیسے اعلیٰ افسر فوج میں شامل کیے قاعدے جاری کیے تنخواہ کی تقسیم کے ساتھ ہی اس کے کیا پھر اور بھی یہ انتظام وقت پر تنخواہ کی تقسیم کا تھا اہتمام کھانے پینے اور ضرورت کے جو کچھ سامان تھے شرح سرکاری مقرر تھا ہر اک کے واسطے منڈیوں سرکاری گوداموں میں غلہ جمع تھا تا کہ قحط اور جنگ میں کام آئے لوگوں کے سدا غلے کپڑے کی طرح گھوڑے مویشی، تیل گھی سستے داموں غلہ کو ہر ایک شے ملنے لگی کوئی بھی قیمت زیادہ کر نہ سکتا تھا وصول ورنہ تھے اس کی سزا کے بھی قوانین و اصول محکمہ خفیہ کا بھی تھا واں بڑا انتظام ہر مخالف کا عیاں ہو جاتا تھا ہر ایک کام ملک کی ہر بات کا لگ جاتا تھا فوراً سراغ حسب موقع کام کرتا تھا شہ روشن دماغ اور نگرانی امیروں کی بطور خاص تھی کیونکہ اکثر سازشیں اس وقت کرتے تھے یہی شاہی منظوری سے شادی کرتا تھا ہر اک امیر تھا خلاف حکم کرنے سے جو خوف دارو گیر اپنے گھر جلسہ نہ کر سکتا تھا کوئی زیہنہار شاہ کے فرمان سے ممنوع تھے خمر و قمار عقل کا خلجی کی اندازہ ہمیں اس سے ہوا حکم پیمائش کا مقبوضہ زمینوں کی دیا اور کی یہ بھی ہدایت عاملوں کے واسطے ظلم لینے میں لگانوں کے نہ اب کوئی کرے

ضابطہ کے تحت سب ہوتی تھی تحصیل و وصول
ایک پیسہ تک نہ لے سکتا تھا کوئی بے اصول
گر کوئی بے عقل کرتا حکم شاہی کے خلاف
تو سزا پاتا خطا ہر گز نہ ہوتی تھی معاف

جنگ پانی پت ۱۵۲۶

لودھی پر بابر نے جب پانی پت میں حملہ کیا
لایا ابراہیم لشکر کہتے ہیں ایک لاکھ کا
توپ خانہ سے جو برسانے لگا بابر شر
فوج لودھی کی ہوئی فوراً اسی سے منتشر
گولہ باری سے جو ہاتھی یک بیک گھبرا گئے
فوج پر اپنی ہی وہ آخر پلٹ کر آ گئے
اتری پھیلی زیادہ اس سے تو پھر اور بھی
فوج لودھی کی ہوئی آشفٹہ خاطر اور بھی
ساتھیوں کے ساتھ ابراہیم بھی مارا گیا
شب چھٹے دن شاہی کا بابر نے اعلان کر دیا

رواداری اسلام

یہ بھی ایک طرہ ہے بے شک مذہب اسلام کا
یعنی دنیا میں مسلمان جتنے تھے فرماں روا
غیر مسلم سے رواداری کا کرتے تھے سلوک
چند لوگوں کے سوا عادل ہوئے ہیں سب ملوک
اتفاقاً گر کبھی کوئی تعدی بھی ہوئی
دخل مذہب کو نہ تھا وہ مصلحت تھی وقت کی

بے تعصب ہونے کا کیا اس سے بڑھ کر ہے ثبوت
اعلیٰ عہدوں پر تھے فائز غیر مذہب کے سپوت

بھگتی تحریک

ہندوؤں میں بھگتی کی تحریک جب پیدا ہوئی
تھی حساب عیسوی سن میں وہ پندرھویں صدی
تھی اثر انداز واں اسلام کی تعلیم بھی
جبکہ رامانند گرو نانک نے یہ تعلیم دی
ہندوؤں حق سے ڈرو بت پرستی چھوڑ دو
جوڑو رشتہ حق سے اور بتوں کا ناتا توڑ دو
مدتوں سے پینٹے آئے تھے ہندو جو لکیر
ان اصولوں کے مخالف تھے بہت حضرت کبیر
بت پرستی کی طرح بے کار ہے سب ذات پات
ہے جو لائق پوجنے کے بس خدا کی ہے وہ ذات
مرتبہ حسین ایک ہے جو مرد ہے انسان کا
کام اچھے ہوں تو حق دیتا ہے بخشش کا صلا
پائے اعلیٰ درجے حق جوئی سے ادنیٰ ذات نے
ملنے ہیں بھگتی سے درجے اور محنت سے صلے
یہ عقیدہ صاف تھا بالکل کبیر اداس کا
مسجد و منبر میں ہر گز مل نہیں سکتا خدا
گر خدا کو ڈھونڈنا ہو تو تمھارے دل میں ہے
وہ کہیں ظاہر نہیں باطن ہی کی محفل میں ہے
وہ عمل بھی ہے برا جو ہو دکھانے کے لیے

عام کر دو اپنی خدمت تم زمانے کے لیے صاف اسلامی جھلک ہے دونوں کی تعلیم میں دونوں تھے یکے موحد اس سے بڑھ کر کیا کہیں ما سوا اس کے جو تھے بنگال اور مہراشر کیسے کیسے تھے موحد اس جگہ بھی جلوہ گر بت پرستی کی جگہ توحید کی تعلیم تھی فرق انسانوں نے درجہ میں نہ تھا تقسیم تھی اس زمانے میں ہزاروں لوگ تھے اہل تمیز ہو گئے تھے صوفیا ان میں بہت ہر دلعزیز حضرت خواجہ معین الدین قلب الاولیا دوسرے ہیں اور بھی مقتدا اللہ رہنا آتے ہیں ان کے ہزاروں پر بلا تفریق سب اور چڑھاتے ہیں وہ گلہائے عقیدت با ادب

(دہلی سکندری۔ ۱۹ اپریل ۱۹۳۵ء)

☆☆

ایک انگریز کا سلام

ہندوستان میں اہل یورپ کی پہلی آمد تو بہت قدیم ہے لیکن سلطنت مغلیہ کے قائم ہونے کے بعد مختلف اقوام فرنگ کا سلسلہ آمد و رفت اور پھر قیام و قوطن بڑھتا گیا۔ اکبر، جہاں گیر، شاہجہاں وغیرہ سب بادشاہوں نے فرنگیوں کے ساتھ بڑی فراخ حوصلگی سے رعایتیں کیں۔ آرمینیا، پرتگال، برطانیہ، فرانس، جرمنی، اطالیہ سے لوگ آتے اور رہتے بستے رہے۔ ان لوگوں میں سے اکثر نے ہندوستان کی معاشرت اختیار کی، یہاں شادیاں کیں، شاعری سیکھی، علوم پڑھتے زبان میں مہارت پیدا کی۔ ان کی مخلوط اولاد نے بھی اپنے اسلاف کی تقلید کی۔ مذہب اکثر عیسائی رہے لیکن بعض بعض مسلمان ہو گئے۔ شاعری سے ان لوگوں کو اس قدر شوق و شغف ہوا کہ بہت سے صاحب دیوان ہوئے۔ ایک فرانسیسی مسٹر جارج پیش شور کے چھ دیوان اردو میں اور ایک دیوان فارسی میں ہے۔ یہ سب حالات بڑی خوبی و تفصیل کے ساتھ رائے بہادر رام بابو سکسینا صاحب کلکٹر بلند شہر نے اپنی تازہ تالیف میں مرتب کیے ہیں۔ پوری کتاب میں ۲۵ صفحے ہیں، تاریخ، حالات اور تبصرے انگریزی میں لکھے ہیں اور انتخاب کلام کا ۴۰۰ سے زیادہ صفحات کا مجموعہ اس کے ساتھ شامل کیا ہے۔

اس تالیف (یورپین اور انڈیورپین شعرائے اردو و فارسی) میں مجھے بعض انگریز و فرانسیسی شعراء کے کلام میں نعت و منقبت کے متفرق اشعار اور مستقل نظمیں بھی نظر آئیں۔ بالفعل و بدیع سکندری کے شہید اعظم نمبر کے لیے ایک انگریز کا سلام بھیجتا ہوں۔ وہ شاعر جان رابرٹس تھا اور مخلوط النسل نہیں بلکہ خالص انگریز تھا۔ اس سلام کو شاعرانہ نظر سے دیکھیے انگریز کے شوق زبان اردو اور ذوق شاعری اور حسن عقیدت کی نگاہ سے ملاحظہ فرمائیے۔

جان رابرٹس کے مختصر حالات یہ ہیں: مشہور جنرل سر ابراہام رابرٹس کے بی بی کا دوسرا لڑکا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی سرفریڈرک مشہور لارڈ رابرٹس تھا۔ جان رابرٹس باپ کے ساتھ انگلستان نہ گیا۔ ہندوستان میں اقامت اختیار کر لی، پھر مذہب اسلام قبول کیا، کھنڈ کو وطن بنایا اور نواب

رمضان علی خاں کی پوتی شہزادی بیگم سے شادی کی۔ اس سے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہوئی۔
فرزند ثانی نادر مرزا اب زندہ ہیں لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ ۷۰ سال کی عمر ہے۔ ان کے پاس اپنے
والد جان رابرٹس کے خاندانی کاغذات اور کلام کے مسودات موجود ہیں۔ رام بابو سکسینا صاحب
نے ان سے دریافت کر کے یہ حالات درج کتاب کیے ہیں۔ جان رابرٹس کا اسلامی نام نہیں لکھا۔
کچھ ہوگا تو سہی مگر قدیم انگریزی نام کے سامنے مشہور نہ ہوا ہوگا۔ ان کا انتقال ۱۳ مئی ۱۸۹۲ء کو
ہوا۔ مذہب میں نہایت پختہ اور روزہ و نماز کے بڑے پابند تھے۔ ان کا تخلص جان تھا۔ سلام کا
انتخاب اور چند متفرق اشعار درج کرتا ہوں۔ (حامد حسن قادری)

سلام

خبر اب جان کی جلدی شہید کر بلا لینا
اسے نارِ جہنم سے قیامت میں بچا لینا
کہا خُرنے یہ بیٹے اور برادر سے شبِ عشرہ
سحر کو باغِ جنت کی سندشہ سے لکھا لینا
دمِ رخصت کہا عباس نے رو کر سیکنہ سے
علی اکبر سے میرے بعد تم پانی منگا لینا
کئے عباس کے شانے تو شہ سے یہ وصیت کی
سیکنہ کو مری جانب سے چھاتی تم لگا لینا
کہا زینب نے فطہ سے مرے سر کی قسم دے کر
ذرا پھر اکبر مہ رو کو میداں سے بلا لینا
کہا سجاد نے زینب سے بلوے میں پھوپھی اماں
وقارِ چادر آلِ عبا سے منہ چھپا لینا
یہی ہے جان کی اب عرض مولا مرتضیٰ تم سے
ہر اک مشکل میں یا مشکل کشا اس کو بچا لینا

☆☆☆

احمد و حیدر و صفدر میں جو ہے نورِ خدا
نظر آنے لگی بندوں میں خدا کی صورت
☆☆☆

حشر کے شور سے تو کاہے کو ڈرتا ہے جان
کیا تو لی تجھے اس شاہِ ولایت سے نہیں

☆☆☆

پھر نہ محشر میں جہنم سے ڈریں گے جان ہم
کر بلا کے اور نجف کے گر رہے زوار ہم

(اخبارِ بدیعِ سکندری رامپور ۷ اکتوبر ۱۹۳۵ء)

☆☆☆

۱۔ از جناب شکور احمد صاحب رعنا اکبر آبادی

ہم نے کتاب ہستی کا ایک ایک صفحہ دیکھا ہے
درد بھری تصویروں میں شانِ حسینی لیکتا ہے
کھیل رہا ہے میدان میں تیروں سے تلواروں سے
لاکھ خدا کے بندوں میں ایک خدا کا بندا ہے
پھول کھلے ہیں یثرب کے کرب و بلا کے دامن میں
آج یہ صحرا یثرب ہے آج یہ جنگل بٹھا ہے
دین پہ مٹنے والے یہ کہہ کے سدھارے دنیا سے
دین ہی رہنے والا ہے مٹنے والی دنیا ہے
آل پیہر پیاسی ہے پہرے نہر پہ بیٹھے ہیں
کوئی توقع کس سے کرے جو ہے وہ خون کا پیاسا ہے
عون و محمد مرنے کو ہنستے کھیلتے جاتے ہیں
شیر خدا کے پیارے ہیں راہ خدا کا سودا ہے
جان نبی کے صدقے سے دین میں یہ بیداری ہے
سونے والا منزل پر سب کو جگا کر سویا ہے
قید میں چپ ہیں اہل حرم آنکھ سے آنسو کیا نکلیں
کون کسی کی غربت میں آنسو پوچھنے والا ہے
سوچ ہے ماں کو میدان سے پھر کے کب اصغر آئیں گے
وہم ہزاروں آتے ہیں دیر سے خالی جھولا ہے
فوجِ عدو ہے دریا پر شاہ کے خیمے ریتی میں
کیسی جلتی ریتی ہے کیسا بہتا دریا ہے
کانپ رہے ہیں ارض و سما اور پوچھنے والا کوئی نہیں
ان کے گلے کیوں کھلتے ہیں جن کو نبی سے رشتا ہے
رعنا تم بھی چلتے ہو جانے والے جاتے ہیں
کرب و بلا کی منزل سے خلد کا سیدھا رستا ہے

سلام رعنا و صبا اکبر آبادی

آگرہ کے بہترین شاعروں میں ایک شکور احمد صاحب رعنا ہیں اور آگرہ بھر کے شاعروں میں ”جوان رعنا“ حقیقی معنوں میں ایک رعنا صاحب ہی ہیں۔ اگرچہ اب جوان نہیں ہیں مگر رعنا اب بھی ہیں۔ ان معنوں میں کوئی اور شخص مشکل سے شاعر پر صادق آیا ہوگا۔ خوش رو، خوش وضع، خوش خلق، خوش آواز، خوش فکر، کیا کیا ”خوش“ رعنا صاحب میں جمع ہیں۔ جس وقت اپنی رسیلی، نرم، مترنم آواز سے غزل پڑھتے ہیں تو یہ سوچا کرتا ہوں کہ ان کی آواز زیادہ شیریں ہے یا کلام۔ ایک سے ایک زیادہ شیریں معلوم ہوتا ہے۔

دوسرے پر کیف، بامزہ، درد بھرا کہنے والے جوان، ہونہار شاعر خواجہ محمد امیر صبا اکبر آبادی ہیں۔ ایک نقاد مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبر آبادی نے رعنا و صبا کا نام ”ادبی جوڑی“ رکھا ہے۔ ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ امر واقع یہ ہے کہ دو موجودہ میں آگرہ کی شاعری کو صنفِ اول میں لانے کے ذمہ دار یہی دو خوش فکر جوان ہیں جن کی بلند پروازیوں، ندرت پسندیوں اور خوش گوئی نے آگرہ کی شاعرانہ فضا کی کاپی پلٹ کر دی ہے۔ آگرہ اس ادبی جوڑی پر بجا طور پر نازاں اور مستفخر ہے۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ آج ہندوستان میں ہر زبان کا جدید ادب الحاد بے دینی کا گہوارہ بنا ہوا نظر آ رہا ہے اس لیے یہ امر باعثِ امتنان و تشکر ہونا چاہیے کہ اکبر آباد کے ترقی پسند شعرا کے سرگروہ اور سرخیل یعنی رعنا اور صبا اس دبائے دہریت سے آزاد ہیں۔ یہ دونوں سلامت روی سے اپنے مذہب اور روایات مذہب کے حامی و مبلغ ہیں۔ رعنا و صبا کلامِ عزا کے سلسلے میں انقلابی شاعر تسلیم کر لیے گئے ہیں اور مرثیہ کی دنیا میں انقلاب مذاق کی بنیاد رکھنے والے یہی دونوں صاحبان ہیں۔ رعنا اور صبا راسخ العقیدہ حنفی المذہب مسلمان ہیں حبِ اہل بیت اور محبتِ شہدائے کربلا کے سلسلے میں حنفی طبقہ کسی اعتبار سے پیچھے نہیں رہ سکتا۔ رعنا و صبا جو کچھ کہتے ہیں اپنے والہانہ جذبات عقیدت کی تائید سے کہتے ہیں۔

مفتی صاحب کے مندرجہ بالا تبصرہ کی تائید و توثیق کے لیے میں حضرات رعنا اکبر آبادی و صبا اکبر آبادی کے دو سلام پیش کرتا ہوں ان میں جذبات کا خلوص، دل کا درد، بیان کی تازگی، زبان کا لوحِ دید کے قابل اور داد کے لائق ہے۔ سلاموں میں ذہن و فکر کی بلند پروازی تو بہت دیکھی ہوگی، قلب و روح کا سوز و گداز بھی دیکھیے:

۲۔ از جناب خواجہ محمد امیر صاحب صبا کبر آبادی

جس دل میں محبت ہوتی ہے، اس دل کی یہ حالت ہوتی ہے
 ہر درد سے تسکین ملتی ہے، ہر رنج سے راحت ہوتی ہے
 جو صبر و رضا کے بندے ہیں، ان کی یہ ریاضت ہوتی ہے
 ہر گام پہ دل جھک جاتا ہے، ہر سانس عبادت ہوتی ہے
 رہ بھی نہ سکیں کہہ بھی نہ سکیں، ایسی بھی مصیبت ہوتی ہے
 چپ رہے تو دل میں ہوک اٹھے، کیسے تو شکایت ہوتی ہے
 افسانہ ابن حیدر کو، جی بھر کے سنا اے مرثیہ خواں
 اس نام سے قوت بڑھتی ہے اس ذکر سے ہمت ہوتی ہے
 ایسے بھی مدارج بخشے ہیں اللہ نے اپنے بندوں کو
 مرجائیں تو زندہ ہوتے ہیں، لٹ جائیں تو عزت ہوتی ہے
 بھائی بھی فدا، بیٹے بھی فدا، بچے بھی فدا بوڑھے بھی فدا
 شبیر کی اس قربانی پر، کونین کو حیرت ہوتی ہے
 شبیر کی اس خاموشی میں، پنہاں ہیں ہزاروں فریادیں
 کرتے ہیں فلک کی سمت نظر جب درد کی شدت ہوتی ہے
 جھکواتا ہے دل انسانوں کے، ایثار حسین ابن علی
 اب تک وہ مصلیٰ قائم ہے، اب بھی تو امامت ہوتی ہے
 جب اپنی ہی آنکھوں کے آگے، لٹ جائے جوانی بیٹے کی
 ماں باپ کے دل سے پوچھے کوئی، دل پر جو قیامت ہوتی ہے
 اصغر کا جنازہ دفنا کر، شبیر چلے ہیں سر دینے
 پیکار کی ضرورت ختم ہوئی، خنجر کی ضرورت ہوتی ہے
 توحید خدائے مطلق کی، جاں دے کے گواہی کس نے دی
 ہے جن کی شہادت فیصلہ کن، اب ان کی شہادت ہوتی ہے
 اصغر کی شہادت پیکار سے، کیا ایک قیامت تھی نہ صبا
 اکبر نے بھی برجھی کھائی ہے یہ اور قیامت ہوتی ہے